تصویرِ احساس

الطاف مشہدی

پبلشرز

اردو اکیڈمی پنجاب بیرون لوہاری دروازہ لاہور

قیمت [illegible] روپے

(میاں محمد حنیف پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر بیرون لوہاری گیٹ سے شائع کیا)


الطاف مشہدی
۸ اپریل ۹۳۶ء

١٣٢ج ٨٩١٤
ل ٨١ ث

انتساب

انتساب، چونکہ صاحب کتاب کے جذباتِ عقیدت کا بہترین اظہار ہے اسلئے میں اپنی ناچیز مساعی کے حاصل "تصویرِ احساس" کو اردو ادب کے سب سے بڑے سرپرست

میجر ملک ممتاز محمد خاں والی جہان آباد ضلع شاہپور (پنجاب)

کے نام سے معنون کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں

آپ کا وجودِ مسعود جہاں صوبہ پنجاب کے غریب اور مزدور طبقہ کیلئے ایک مخلص اور ہمدرد کا درجہ رکھتا ہے وہاں گلستانِ ادب کیلئے بھی "باغبان" کہلانے کا مستحق ہے۔ آپ کی ادب نوازی کے متعلق کچھ کہنا دراصل تحصیل حاصل ہے۔ فی الحقیقت آپ کی ذاتِ ستودہ صفات سے خادمانِ اردو کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں اور یقین غالب ہے کہ آپکے خاندانِ عالیہ کی انتہاہ نوازشات سے اردو کے خوشہ چینوں کی آرزوئیں ہمیشہ بوجوہ احسن بارور ہوتی رہیں گی +

عقیدت کیش

الطاف

۲۰۔ مارچ ۱۹۳۹ء

مُقدّمہ

(از علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ دہلوی)

یہ بہت ٹھیک کہا گیا ہے کہ شاعر کی ذہنیت جبلّت سے کچھ ہی استعداد اور قابلیت کی مالک ہو۔ اسکی شاعری اکثر و بیشتر ماحول سے اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ ادب میں ماحول کا اطلاق اُس مذاق اور کلچر پر ہے جو سماج کے ذہن اور شعار پر حاوی اور اس کے کردار میں ساری ہو۔ ہماری شاعری عام طور پر دیکھتے ہوئے ابہام کے کرشموں سے شروع ہوئی۔ پھر داخلی رنگ میں ڈوب کر درد و اثر کا روحانی مجسّمہ بن گئی۔ ایک طویل مُدّت کے بعد وہ محض خارجی اڑ گڑے میں پھنس گئی۔ کچھ دنوں دونوں کا میل رہا۔ داخلیوں نے تصوّف اور روحانیت کی مدد سے اپنے رشحات طبع کو خارجیت کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ مگر چونکہ یہ رنگ عمل کا متقاضی تھا۔ اور اس میں ہر کسی کا پُورا اترنا معلوم اس لئے یہ رنگ بھی محض مسائل یعنی ذات و صفت تشخص و عکس۔ حدوث و قدم اور "اوست" "ہمہ از وست" کے گورکھ دھندے میں آ کر پھیکا پڑ گیا۔ زمانہ نے کروٹ بدلی۔ ادب اور شاعری میں ایک انقلاب عظیم رُونما ہوا فطرت اور واقعیت کی طرف طبائع نے رجُوع کیا۔ مگر چونکہ اس طرز کا نباہ ایک انوکھی داخلی خارجیّت اور وسیع نظری چاہتا تھا۔ جو التزام اکثر شعراء کے مطمع نظر کی حد سے

بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے یہ طرز" دندان جملہ در دہن" یا بلیغ کلاسیکل ہو گیا۔ اور اکثر نظیر یا انیس کی نقل بن کر رہ گیا سماج کے ماحول نے پھر کروٹ لی۔ اور ملی شاعری نے اپنا رنگ جمایا جس کی ابتدا مسدس حالی سے ہوئی منشی گورکھ پرشاد عبرت گورکھپوری کا مسدس نشو ونمائے ہند اور راقم کا مسدس بھارت درپن۔ یہ تین تصنیفیں کتابی صورت میں اس عہد کی ملی شاعری کے نمونے ہیں مسدس حالی پہلے دہلی میں چھپا تھا۔ مگر باقی دونوں کتابوں کی اشاعت پنجاب میں ہوئی۔ دہلی اس وقت پنجاب میں شامل تھی۔ اس لئے گویا ان تینوں مسدسوں کی اشاعت پنجاب سے ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ پنجاب کی جدت پزیری ضرب المثل کا حکم رکھتی ہے۔ عہد حاضر سے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ پچھلی نصف صدی کے واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ نیچرل یعنی نئی شاعری۔ ملی شاعری۔ خواہ کسی کی ذات سے حادث ہوئی ہو۔ اس کی توسیع و توشیح اور ارتقا پنجاب ہی میں ہوا۔ یہ سب کچھ تو ہوا اور ہو گیا۔

پبلک کے ماحول نے ایک اور کروٹ لی سماج کے ذہنی افق پر نئے ستارے طلوع ہوئے مدتوں کے سوتے انگڑائیاں لینے لگے۔ بیداری کے آثار نمایاں ہوئے اور وطنیت کی اذان کا نعرۂ تکبیر کل آبادی میں گونج اٹھا۔ چونکہ وطنیت کا جذبہ عمل چاہتا ہے۔ قوم کی بڑی تعداد وطن کی خدمت میں جان و دل سے مصروف ہو گئی لیکن چونکہ ہر قسم کی جنگ کے قائم رکھنے اور ارباب بزد کا دل بڑھانے کے لئے رجز ضروری ہے۔ خواہ وہ پرانے چارن یا آجکل کے جنگی بینڈ کی صورت میں ہو۔ اس لئے قدرتی طور پر وطنیت کے ساتھ ساتھ جذباتی اور رومانی شاعری کا ظہور ہوا۔ کیونکہ زندہ دلی کے بغیر

زندگی بے لطف ہے۔ اور جذبہ کے بغیر جنگ اکارت۔

جن عزیزوں نے اس ماحول میں آنکھ کھولی ان کی سخن سرائی اس رنگ سے کس طرح عاری رہ سکتی تھی۔ چنانچہ آجکل ہماری شاعری کی فضا پر وطنیت کے ساتھ جذباتی اور رومانی رنگ چھایا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اشتراکیت یعنی سرمایہ اور محنت کا قضیہ نامرضیہ بھی شعر کا دلپسند موضوع بن گیا ہے۔ اور چونکہ ہر جدت پنجاب میں بہت جلد جڑ پکڑ لیتی ہے اس لئے آجکل یہی رنگ یہاں کے شعرا کے کلام کا مابہ الامتیاز ہے۔ ملک کے اور حصے اس طرز سے بیگانہ نہیں۔ اور پنجاب میں بھی مستثنیات موجود ہیں۔ لیکن عہد حاضر میں پنجاب کی شاعری عموماً اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور یہی رنگ چوکھا سمجھا جاتا ہے عزیز الطاف مشہدی کا کلام بھی اسی رنگ کا ہے۔

جس طرح بوڑھوں کی زباں پر وصل و اختلاط اور جذبۂ اشتیاق کی باتیں نہیں پھبتیں اسی طرح ایک جوان آدمی کے کلام میں پند و نصائح اور زہد خشک زیب نہیں دیتا۔ سید الطاف مشہدی کا کلام آورد اور تصنّع کے بہروپ سے پاک ہے۔ وہ جوان ہیں۔ ان کا کلام بھی جوان ہے۔ انہوں نے سلیم المزاجی کے ساتھ جوشیلی طبیعت پائی ہے۔ اس وجہ سے اُن کا کلام بھی نقلی نہیں۔ اصلی جذبات کا آئینہ دار ہے اور شبابیات کا خمخانہ۔ ان کے دل میں وطن کی محبت ہے۔ اس لئے وطنیت کے جذبات بھی ان کے کلام میں موجود ہیں وہ جب ادھر سرمایہ داری اور اُدھر بیروزگاری اور محنت کی بیقدری دیکھتے ہیں۔ تو ان کو جوش آجاتا ہے۔ اور غریب مزدور کی زار حالت پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے اُن کی

شاعری کا تجزیہ اور بھی ہے۔ آجکل کی شاعری کا تبصرہ۔
سید الطاف کو زبان کی گھلاوٹ اور بیان کی دلفریبی کا عطیہ قدرت سے ملا ہے۔ بیساختہ پن ان کے اسلوب کی شان ہے۔ رفعت تخیل اور معنی آفرینی کے چکر میں وہ اپنے مافی الضمیر کو پاور ہوا نہیں کر دیتے۔ آجکل کے تبصرہ نگار ندرت اور انفرادیت پر بہت زور دیا کرتے ہیں۔ اور اسی کو ایک شاعر کی شاعری کا پایہ قائم کرنے میں میزان قرار دیتے ہیں۔ اس کا اطلاق پر اتم شاعروں یا قدما کے کلام پر ہو۔ تو مضائقہ نہیں۔ آجکل ایک جوان شاعر کے کلام میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس میں آمد اور بیساختہ پن کہاں تک ہے۔ اس کے جذبات اور دلولے خود رد ہیں۔ یا ساختہ پرداختہ وہ اپنے داخلی اور خارجی عوارض کی سچی ترجمانی پر قادر ہے یا نہیں۔ ان اصولوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اس مجموعہ کو جانچا جائے۔ تو مجھے اُمید ہے پورا اُترے گا۔ دیرینہ سن اور کہنہ مشق شعرا تو بن چکے۔ جو بننے تھے اور ہو گئے جیسا ہو سکتے تھے۔ نوخیز شاعروں میں ہونہاری کا عنصر بھی دیکھنے والا ہوا کرتا ہے۔ اس نظر سے بھی سید الطاف کی شاعری میں ترقی کے بہت آثار پائے جاتے ہیں۔ آجکل عموماً ترقی کے معنی رفع نقائص لئے جاتے ہیں۔ یہاں نفس مدعا اس سے مختلف ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ شاعر کہاں تک ترقی کر سکیگا یا فلسفہ کی زبان میں یہ کہیئے کہ اس کی شاعری میں ارتقا کے کیا کیا امکانات ہیں۔ یہ امکانات سید الطاف کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ مجھے ان کا کلام دیکھنے کا اتفاق خاصی مدت سے ہے اور اسی بنا پر ان کے متعلق میری یہ رائے قائم ہوئی ہے۔ آیئے اب ذرا اس باغیچۂ سخن کی سیر کریں۔

غزل گو شعرا خوب نفع میں رہتے ہیں۔ کیونکہ موضوع کا اختلاف ہوتا ہے اور تسلسل سے غزل کو واسطہ نہیں تبصرہ لکھنے والا مفرد شعر نکال کر قارئین کے سامنے رکھدیتا ہے آج کل کے کلام اسکی اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ نظمیں مسلسل ہوتی ہیں۔ پوری نظمیں نقل کی جائیں۔ تو طوالت اور محض عنوانوں کے نام گنانے سے تشنگی کا نقص عاید ہوتا ہے خیر یہاں پہلے وطنیت کو لیتے ہیں۔ ماں کی دعا۔ ماں اپنے بچے کے حق میں دعا کرتی ہے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سنئے اور یاد رکھئے :-

تیرے دم سے پھر وطن والوں میں پیدا ہو حیات
پنجۂ اغیار سے ہو ہند کو حاصل نجات
کام آجائے وطن کی راہ میں تیرا شباب
غیر ہیں زندانیوں کی پھر الٹ ڈالیں نقاب
تو بدل ڈالے نظام ہند کے لیل و نہار
یہ غلام آباد ہو آزاد ملکوں میں شمار
ہڈیاں پس کر بنیں غازہ عروس ہند کا
حسن پھر ہو جائے کچھ تازہ عروس ہند کا
ہو پسینے سے ترے روشن چراغ انقلاب
مطلع مغرب پہ چھا جائے بلاؤں کا سحاب
تیرے ہونٹوں سے بوقت مرگ یہ نکلے صدا
نوجوانانِ وطن آگے بڑھو! آگے ذرا!

اے مرے سینے کی ٹھنڈک کہ اے مری آنکھوں کی آب

بارگاہِ ایزدی میں یہ دُعا ہو مستجاب

ایک اور نظم ہے جس کا عنوان ہے "میرا پیارا"۔ یہ ساری نظم نہایت پُر تاثیر اور دلکش ہے۔ اِسی ضمن میں ایک اور نظم کا ذکر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کا عنوان ہے "محبوبہ کی شرط"۔ یہ نظم حُبِّ وطن کے نہایت لطیف جذبات کی حامل ہے مطلع کا شعر ہے ۔

تمہارے ہجر میں مرنا قبول کر لوں گی　　غموں میں جی سے گذرنا قبول کرلونگی

کبھی جو مست گھٹائیں فلک پہ چھائینگی　　تو بجلیاں سی رگ و پَے میں دوڑ جائینگی

یہ سب درست ہے تڑپا کرونگی راتوںکو　　تمہارے ہجر میں آہیں بھرونگی راتوں کو

غرورِ عرب مگر جب تلک نہ شرمائے

دیارِ ہند میں جب تک نہ پھر بہار آئے

اسیرِ دامِ غلامی نہ ہوں رہا جب تک　　ملے نہ داغِ غلامی کا خوں بہا جب تک

شرابِ وصل کا اک گھونٹ بھی نہ پاؤ گے

یہ وُہ کلام ہے جو منجمد سے منجمد قلب کو بھی گرم کر دیتا ہے. ہلا دیتا ہے۔ اور تحریکِ عمل کرتا ہے۔ مُبارک ہیں وہ جواں بخت شاعر جو معانی و بدیع کے غوامض اور نکات کو طلاق دیکر مطلب نگاری اور وطن پرستی کی طرف مائل ہیں۔

معاشیات کی ذیل میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ نان و ایمان چند

شعروں میں اِقتصادیات کہیئے۔یا دین ودنیا۔ یا دنیا و عقبیٰ۔سب کا تجزیہ کر کے رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں۔

نان کی مضراب سے ہے وجد میں سازِ حیات
نان کی تنویر سے روشن ہی بزمِ کائنات
نان ہی رُخ پھیرتی ہی گردشِ افلاک کا
زندگی کے حادثوں کی جرأتِ بیباک کا
الغرض لازم ہے اتنی نان جینے کے لئے
جسقدر ملّاح لازم اک سفینے کے لئے

اور ایماں نام ہے اُس قوّتِ موہوم کا
چھینتی ہے جو متاعِ زندگی معصوم کا
پھانستی ہو جو غریبوں کو خدا کے نام پر
چٹپٹے الفاظ کے دانے بچھا کر دام پر
چھین لے جو نوجوانوں سے جوانی کا خمار
سادہ لوحوں کو بنائے مولویّت کا شکار
ایسے ایماں کو ہمارے دُور سے لاکھوں سلام
ہو رہی ہے جس سے اپنی زندگانی تک حرام

ایک اور نظم ہے مزدور کی بیوہ۔ کہتے ہیں۔

اِک حسینہ مانئی قدرت کا لاثانی کمال
لب پہ شکوہ اور دل میں گھر اُجڑنے کا خیال
عبرتیں ہر دل کے کاشانے میں چونکاتی ہوئی
زندگانی کی روِش پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی

مصیبت کی ماری خدا سے فریاد کے لہجے میں کہتی ہے۔

کس طرح تیرے نظامِ سیم و زر کی آبرو
تھوکتی ہے دیکھ کر افلاس زادوں کو لہو

شاعر اسے سمجھاتا ہے۔ خدا کے قہر سے ڈر اور شکوہ شکایت بند کر۔ اس پر وہ جھنجلا کر کہتی ہے۔ سُن کے گرجی اور گرج کر اس طرح کہنے لگی۔

اے جواں۔ اے اعتقادوں کے سلاسل کے اسیر
کاش چہرے سے اُلٹ سکتا ردائے ضمیر

شکر و شکرانہ کے دے دے کر یہ برسات خراج
تیرے جیسوں ہی نے "خالق" کا بگاڑا ہے مزاج

کس طرح مانوں میں ایسے قاضی حاجات کو
خونِ بیکس کی حِنا سے جو سجائے ہات کو

اس لئے مانوں کہ میری نوجوانی کی بہار
دم زدن میں اس نے کر دی ہے خزاں سے ہمکنار

لیکن اس پر بھی میں شکر اس کا بجا لاتی رہی
دل کے زخموں پر ستم کی برچھیاں کھاتی رہی

آج لیکن ہوگئی جور و ستم کی انتہا
آہ میرا لال۔ میری زندگی کا آسرا

سُن کے رُو داد ستم باب حقیقت کھل گیا
دل بغاوت پر خدائے دو جہاں کی تل گیا

اِقتصادی بے عنوانیاں اور حادثات و مکروہاتِ دنیا کس طرح انسان کے خیالات میں اِنقلاب عظیم پیدا کر دیتے ہیں۔ اس پر یہ نظم پوری روشنی ڈالتی ہے۔

شاعر کا شاہکار حقیقت میں نہ صرف جذباتی شاعر کے حق میں شاہکار کا حکم رکھتا ہے۔ بلکہ اس مجموعے کے شاہکاروں میں سے ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے۔ "یہ میرے معبود" کیا رواں دواں اور ولولہ انگیز ہے۔ ایک بند یہاں لکھا جاتا ہے۔

پریم کے ساگر میں جیون کا سندر روپ سفینا

وصل کی شب دولھن کے رخ پر خوشبودار پسینا
چاند کی متواری کرنوں کا ہنس ہنس پڑتا زینا
آزادی کے مے خانے میں جھوم جھوم کر پینا
یہ میرے معبود
سمجھیا

یہ میرے معبود

"ہوا کے جھونکے کی تمنا" میں وطنیت اور تخئیلِ شاعری کس خوبصورتی سے شیر وشکر ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں۔

الہٰی نرم رخساروں کو چوموں یہ نہیں خواہش۔ بہکتی انکھڑیوں سے پی کے جھوموں یہ بھی نہیں وُہ بھی نہیں۔ آخر وہ تمنا کیا ہے۔ وہ تمنا یہ ہے اور کتنی پاکیزہ تمنا ہے

تمنا ہے مجاہد کھیلتے ہوں جب شراروں سے
وطن کا نام چمکاتے ہوں شمشیروں کی دھاروں سے
میں بن کر سانس اُن کے آہنیں سینوں کو گرماؤں
حیاتِ جاودانی کا جہاں میں مرتبہ پاؤں

اس نظم کی روانی اور خمریت زاہد صد سالہ کی رگوں میں بھی بجلی کی سنسنی پیدا کر دیتی ہے۔ عنوان ہے پیتا جا۔ کہا ہے :-

رموزِ زیست سے پردہ اُٹھا کے پیتا جا

شباب و شعر کی وسعت پہ چھا کے پیتا جا
غرورِ زُہد کو نیچا دِکھا کے پیتا جا
متاعِ عہدِ جوانی لُٹا کے پیتا جا!
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتا جا

ایک نظم تو بہ اُس لطف کی ہے کہ اسے بار بار پڑھ کر بھی جی نہیں بھرے گا - ایسی نظموں سے اقتباس سراسر بے رحمی ہے -

وہ نظم جس کا عنوان ہے "شرم" نہایت سبق آموز ہے

آج کل دونوں طرف سے دیہات پر نظرِ شفقت اُٹھ رہی ہے - اس لئے وہ نظم جس کا عنوان ہے "گاؤں کے تاثرات" بے محل نہیں کہی جا سکتی اور چونکہ الطاف کو دیہات سے واسطہ بھی ہے - اس لئے اگر کوئی اِسے واقعاتی نظم سمجھے تو ان کو شکایت کی جگہ نہ ہونی چاہیئے -

ایک نظم ہے "میری ہستی" لطافتِ اِحساس کی پوری داد دی ہے - اس کے چند شعر یہ ہیں - پڑھیئے اور اپنی ہستی بھی ایسی ہی بنائیے :-

حِنائی انگلیوں میں دیکھ کر کاسہ گدائی کا
اتر جاتا ہے چہرہ غم سے میری کبریائی کا
حسیں آنکھوں میں جب اشکوں کی شمعیں جگمگاتی ہیں
تو دل کو درد کی بیتابیاں آنکھیں دکھاتی ہیں

مسافر کی نظر میں پڑھ کے غم اندوز افسانے
مرے ماحول کی رنگینیاں لگتی ہیں شرمانے

مری ہستی عجب ہستی ہے اس خونخوار بستی میں

غزل اگرچہ کم کہتے ہیں۔ لیکن جب کہتے ہیں تو اس میں نظم سے کم سحر آفرینی نہیں ہوتی ایک غزل کے چند شعر یہاں دئیے جاتے ہیں :-

لپٹا ہوا ہوں سایۂ غربت میں گھر سے دور
دل سے قریں ہیں اہلِ وطن اور نظر سے دور

جب تک ہے دل رہینِ مآل و اسیرِ عقل
رہنا ہے تجھ سے اور تری رہگذر سے دور

اک دن اُلٹنے والی ہے زاہد بساطِ زُہد
کب تک رہیگا دل نگۂ فتنہ گر سے دور

وہ کوئی زندگی ہے۔ جوانی ہے وہ کوئی
اے دوست جو ہے تیرے جمالِ نظر سے دور

اے حسنِ بے پناہ بتائے کوئی مجھے
دُنیا کی کون چیز ہے تیرے اثر سے دور

اللہ رے نصیب کہ پائی ہے وہ فغاں
جو عمر بھر رہی ہے فریبِ اثر سے دور

الطاف نازہ اپنی گدائی پہ ہے مجھے
دامن ہے اسکا سایۂ لعل و گہر سے دور

آخر میں یہ کہنا ہے کہ یہ مجموعہ جو واقعی اسم با مسمّٰی یعنی تصویرِ احساس ہے مصنّف کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسے اُردو شاعری کے عہدِ حاضر کا ایک بہت اچھا نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ تخیّل کی سہتی سہتی چٹکی واردات دل کو دلآویز بنا دیتی ہے۔ الطاف صاحب نے زبان وہ پیاری اور سہانی پائی ہے۔ کہ ان کے

مولد و منشاء کا حال معلوم کر کے انسان حیران رہ جاتا ہے۔ جذبات کی قوّت اور پاکیزگی اور ولولہ انگیزی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی عموماً توقّع کیجاتی ہے امید ہے کہ اربابِ ذوق کھلے دل سے اس مجموعے کی قدر کرینگے جس کا وہ مستحق ہے؛

کیفیؔ

دیباچہ

(از مسٹر کرشن چندر۔ ایم۔ اے)

اِلطاف کی شاعری میں مجھے ایک نئے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے وہ شاعری اور وہ رنگ جو متقدمین میں قطعاً مفقود ہے۔ اس سے میری مراد کسی شاعر کی تحقیر نہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب زندگی کی پیداوار ہے۔ آج تک دُنیا کے کسی بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جسے "ادب برائے ادب" کہا جا سکے "ادب برائے ادب" محض ایک خیالی ڈھکوسلہ ہے اور کچھ نہیں ورنہ دنیا کے ہر ایک ادب کا خمیر زندگی ہی سے اُٹھا ہے۔ ادب کی اوّل اور انتہا "زندگی" ہے ادب اچھا ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ اور اچھا ہونا اور بُرا ہونا بھی محض اضافی اصطلاحیں ہیں اور ادب کی اچھائی یا برائی کسی خاص زاویۂ نگاہ پر منحصر ہوتی ہے۔ لیکن ادب چاہے اچھا ہو یا بُرا، زندگی سے باہر نہیں جا سکتا۔ ادب کا منبع زندگی ہے اور اس کا منتہائے مقصود بھی زندگی!

مثال کے طور پر شیکسپئر کو لیجئے۔ انگلستان کا بہترین شاعر، لیکن بہترین اسلئے نہیں کہ اُس کی شاعری اور زبان میں چند ایسے خواص ہیں جو "ادب برائے ادب" کے معیار ہی اصول پر پُورے اُترتے ہیں۔ اور اس لئے شیکسپئر کا نام تا ابد زندہ رہے گا

بہترین اسلئے نہیں کہ وہ چاسر کے زمانے سے لیکر جیمس مسکلیٹن تک انگریزی زندگی کے ارتقائی پہلوؤں پر حاوی ہے۔ یہ بات صریحاً غلط ہے گو میں سمجھتا ہوں کہ اکثر انگریز نقاد جو کھاتے پیتے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں شیکسپیئر کی شاعری میں انگریزی زندگی تو کیا جہان بھر کی قوموں اور تمام دنیا کے انسانوں کی زندگی کا عکس دیکھتے ہیں اور نہ صرف زندگی کا عکس بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھکر۔ یعنی خالص ادب۔ ایسا ادب جو زندگی سے الگ ہے اور جسکا وجود غالباً ان انگریز نقادوں کے دماغوں کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ درحالیکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ شیکسپیئر الزبتھی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اس زمانے کی کہ جب انگریزی معاشی نظام کی کایا پلٹ ہو رہی تھی اور جاگیردارانہ نظام صنعتی نظام میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اور بس۔ شیکسپیئر کی شاعری اُسی ذہنی و معاشی کشمکش اور بدلتے ہوئے دور۔ اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی صنعتی اور سرمایہ دارانہ طاقت کا پیش خیمہ ہے شیکسپیئر یقیناً موجودہ دور کی ترجمانی نہیں کرتا۔ انگلستان کے موجودہ سامراجی نظام کو بہترین صورت میں پیش کرنے والا کپلنگ ہے۔ اگر غدر کی سیاست اور قنوطیت کا مظہر غالب ہے تو اقبال کی پُرجوش حیاتی شاعری موجودہ دور میں مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی بڑھتی ہوئی بیداری کو خصوصاً اور عام متوسط طبقہ کے معاشی و ذہنی ہیجان کو عموماً نہایت واضح صورت میں پیش کرتی ہے۔ ادب زندگی سے باہر نہیں جا سکتا۔

یہاں تک تو معاملہ صاف ہے کہ ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ چاہے وہ

الف لیلہ کی بظاہر خیالی کہانی ہو یا الطاف کی انقلابی شاعری۔ اب سوال رہ گیا کہ کونسا ادب اچھا ہے؟ اور کونسا ادب برا۔ بالفاظ دیگر کونسی زندگی اچھی ہے اور کونسی بُری؟ انسانی زندگی کے ارتقا میں اگر آپ بنظر عمق دیکھیں گے تو آپ کو انسان جماعتوں میں بٹے ہوئے نظر آئیں گے۔ قبیلے اور قبیلوں کے سردار۔ مالک اور ان کے غلام۔ جاگیردار اور جاگیرداروں کے مزارعین، آگے چلکر سرمایہ دار اور مزدور سامراج اور غلام نو آبادیات کے لوگ بس انسانوں کی تفریق کچھ اسی طرح ہے اور یہی تفریق برابر دُنیا کے ہر ادب میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ادب زندگی کا عکس ہے۔ ایک ادب وہ ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر قبیلہ کے سرداروں۔ مالکوں جاگیرداروں سرمایہ داروں اور سامراج پسندوں کی حمایت کرتا ہے اور اس طرح سے شاعر کے اپنے جماعتی رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا ادب وہ ہے جو اسکے مقابلے پر قبیلے کے حسیات و جذبات۔ غلاموں، مزدوروں اور نو آبادیاتی لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور میرے لئے اور میرے بہت سے ساتھیوں کے لئے اور اس لئے ادب کے متعلق بھی بس یہی زاویہ نگاہ ہے کہ وہ ہر چیز جو مؤخر الذکر لوگوں کی حمایت کرتی ہے اچھی ہے اور جو ان کی مخالفت کرتی ہے یا خاموش رہ جاتی ہے بُری ہے ایسے ممکن ہے ایک تنگ اور محدود زاویۂ نگاہ کہا جائے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ جماعتی حدبندیاں شاعری پر کبھی نظر انداز نہیں ہوتی ہیں۔ جو شاعری سرمایہ داروں کو خوش کر سکتی ہے۔ وہ مزدور پیشہ لوگوں کے جذبات کو تسکین نہیں دے سکتی۔ ہاں دھوکا ضرور دے سکتی

ہے۔ مثلاً جب کوئی شاعر یہ کہتا ہے ؎

یہ مایا آنی جانی ہے

یہ دُنیا بہتا پانی ہے

تو میں صاف پہچان جاتا ہوں کہ یہ شاعر رجعت پسند ہے۔ نادانستہ طور پر ہی سہی لیکن یہ غریب لوگوں کی توجہ ان کے معاشی مسائل سے ہٹا کر محض چیڑی چیڑی دُور از کار باتوں سے ان کا جی بہلانا چاہتا ہے اور اس طرح سرمایہ داری کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ بخلاف اسکے جب الطاف غیض وغضب میں آ کر کہتا ہے ؎

وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہُوا

دیارِ ہند کو وقفِ بہار کرتا ہُوا

خوشی سے جھومتا گاتا گرجتا آؤں گا

مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا

جو ہنی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن

اور

پھر دیارِ ہند کو آباد کرنے کے لئے

جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

ہر تہی داماں شکوہ خواجگی کا ہو جواب

ہر جوانی کو عطا ہو خضر کا رنگیں شباب

ذرّے ذرّے کی زباں پر ہو صدائے انقلاب
مغربی زردار کو ناشاد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ الطاؔف ادب میں سامراج پسندوں کی مخالف سمت میں کھڑا ہے۔ اسکے جذبات کی ہیجانی کا ایک خاص رُخ ہے اور اس کے سرفروش جذبات میں وطنیّت اور مزدُور کی محبّت جھانک کر ہندی عوام کو پیغامِ عمل دے رہی ہے ۔

نوجوانو تم کو اپنی زندگی کا واسطہ
مادر ہندوستاں کی بے بسی کا واسطہ
واسطہ ناکتخداؤں کے پھٹے ملبوس کا
واسطہ افلاس کے روندے ہوئے ناموس کا
واسطہ ان کا کہ فاقوں کی بدولت جو غریب
ہو رہے ہیں موت کے خونخوار جبڑوں سے قریب
برچھیوں سے قیصریّت کے جگر کو چیر کر
مادرِ ہندوستاں کی آبروُ کی لو خبر

الطاؔف ان شاعروں سے کس قدر مختلف ہے جو ہر مصرعے میں انسانی اخوّت اور مساوات کے راگ گاتے ہیں اور اس طرح بالواسطہ یا بالا واسطہ طور پر اپنے آپکو ایک خاص جماعت کا حامی بنا لیتے ہیں۔ الطاف نے جماعتی امتیاز کو نہایت اچھی طرح سے پہچان لیا ہے اور یہی پہچان اُسے مجبور کئے دیتی ہے کہ وہ اپنی تمام تر تخلیقی قوتیں "گل و بلبل" کے بے سرو پا رجعتی راگ گانے کی بجائے دَورِ مہاجنی کی چنگیزیوں کو عیاں کرنے میں صرف کر دے ۔

ہوش میں آ توڑ کر رکھدے غلامی کی کمند
ڈال آزادی کے میداں میں ترقی کا سمند
آ بدل دیں اُٹھ کے ہندی کی غلامانہ روش
آ کچل دیں زر کے بندوں کو کہ مٹ جائے خلش
آ کہ سفّاکانہ فطرت ہی کو کردیں ختم آج
آ کہ دنیا سے مٹا ڈالیں جفاؤں کا تراج

انقلابی شاعری کا یہ سیلاب عظیم یقیناً سرمایہ پرستوں کو اور ان کے حواریوں کو خوش نہیں کرسکتا۔ الطاف کی شاعری سے اس قسم کی توقع بے سُود ہے وہ دھوکا دینا نہیں جانتا۔ ان شاعروں کی طرح جو عموماً اپنے کلام میں موت کی مساوات کا راگ گاتے ہیں "دیکھئے نا، صاحب کیا ہُوا اگر اس دنیا میں امیر اور غریب اور ظالم اور مظلوم ہیں۔ آخر بے چارہ سرمایہ دار بھی انسان ہے۔ اُسے بھی ایکدن موت آئیگی اور قبر میں اسے چھ فٹ سے زیادہ جگہ نہیں مل سکتی۔ یوں بھی تو اگر ایک حمام میں ایک امیر اور غریب کو اکٹھے کھڑا کرکے ننگا کردیا جائے تو دونوں میں کوئی امتیاز نہ دکھائی دے گا۔ پس ثابت ہوا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں"۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ کیسا عجیب فلسفہ ہے اور پھر لطف یہ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ واقعی اسی قسم کی باتوں سے غریب لوگوں کا دل بہلایا جاسکتا ہے اور شاعری سے بھی افیون کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن الطاف یہ افیونی شاعری نہیں چاہتا۔ وہ موت کی مساوات کا قائل نہیں وہ زندگی میں مساوات دیکھنا چاہتا

ہے۔ وہ زندگی جہاں ۔

خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں ۔ ہے لہو سے جس کے رنگیں اہل زر کی آستیں
محنت و اندوہ و غم شام و سحر جسکی غذا ۔ جگمگاتا ہے پسینہ بن کے بجلی کی ضیاء
جسکی ہے گاڑھی کمائی سودخواروں کیلئے ۔ جسکی جانِ نثار ہے سرمایہ داروں کیلئے

وہ اس زندگی میں مساوات کا قائل ہے قبریں نہیں اور جب اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنتے ہوئے نہیں دیکھتا تو چیخ اٹھتا ہے۔

کس طرح مانوں میں ایسے قاضئ حاجات کو
خون بیکس کی حنا سے جو سجائے ہات کو
اس لئے مانوں کہ میری نوجوانی کی بہار
دم دن میں اُسنے کردی ہے خزاں سے ہمکنار
اس لئے مانوں کہ میری زندگی بھر کا رفیق
مونس و غمخوار و ہمدرد و بہی خواہ و شفیق
بیکسی کے زرد ہونٹوں کا پیالہ بن گیا
موت کے خونخوار جبڑوں کا نوالہ بن گیا

یا پھر جب کثرتِ آلام سے تھک جاتا ہے اور شدّتِ احساس اور معاشی مصائب کا انبوہِ عظیم اس جان پر بھاری ہو جاتا ہے تو اپنی مجبوریوں اور ناکامیوں کو مئے باقی کی تلخیوں میں گم کرنا چاہتا ہے ۔

اس غلام آباد میں کچھ روز جینے کے لئے
دوست ہر خوددار ہے مجبور پینے کے لئے

الٰہی ! گر مجھے اس ہند میں کچھ روز جینا ہے
تو میری قوّتِ احساس مردہ ہو کے رہ جائے

دلِ خود دار بارِ ذلتِ افلاس سہہ جائے
جبھی ہیں یہ سکوں گا شاد محکوموں کی بستی ہیں

لیکن ہر سیاست عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔

الطاف کے کلام میں سوز اور درد ہے اور جوش اور ولولہ۔ لیکن ان جذبات کی وسعت محبّت ہی تک محدود نہیں۔ اُسنے خود رہنے کیلئے محبت کا دائرہ وسیع کرلیا ہے۔ بجائے ایک خیال یا اصلی محبوب کے اُسے عوام سے محبت ہے۔ وہ ایک پھول سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ سارے چمن سے۔ اُسے ایک پھول کے مرجھا جانے سے افسوس نہیں ہوتا۔ اُسے افسوس ہے تو یہ کہ سارے چمن پر خزاں چھا گئی ہے۔ اسی خبر نے اُسے موجودہ نظام سے اسقدر متنفر کردیا ہے۔ "نان و ایمان"۔ میری رائے میں اس نفرت کو نہایت واضح طور پر اور سائنٹفک نکتہ نگاہ سے پیش کرتی ہے اور اس نظم کو اس مجموعہ میں شاعر کا شاہکار سمجھنا چاہیئے۔ جو لوگ مذہبیت کی آڑ میں لوگوں کو اُلّو بنالیتے ہیں۔ انکی مذہبیت پر طنز کے تیر و نشتر چبھوئے ہیں۔

اور ایماں نام ہے اُس قوتِ موہُوم کا
چھینتی ہے جو متاعِ زندگی معصوم کا
جو چھپا کر پیٹ کے بندوں کو اپنی آڑ میں
رات دن رکھتی ہے مزدوروں کے خوں کی تاڑ میں
جو پہن کر لیڈری کا معصیت آلودہ بھیس
بیچتی ہے مغربی زردار کے ہاتھوں میں دیس
گردنوں کو جو جھکائے سیم و زر کے پاؤں میں
خُونِ دہقاں سے نہائے ڈاڑھیوں کی چھاؤں میں
پھانستی ہے جو غریبوں کو خدا کے نام پر

چٹپٹے الفاظ کے دانے بچھا کر دام پر

الطاف کی شاعری کھاتے پیتے متوسط طبقہ اور اُمرا کیلئے ہرگز مفید نہیں۔ اسمیں گل وبلبل کے قصّے عیش ونشاط کی طربناکیاں، ہجر وصال کی پُرلطف ورنگین داستانیں بہت کم ہیں۔ الغرض اربابِ نشاط کی جنسی تسلّی کا کوئی سامان نہیں، ہاں الطاف کی شاعری میں مزدوروں اور کسانوں کی تکالیف کا احساس شدّت کے ساتھ موجود ہے۔ اسکے نغموں میں مظلوموں کی حمایت کا چشمہ اُبل رہا ہے اور اس کے شباب کی سرمستیاں اور رعنائیاں وطنی جذبات کی لہروں کے ریلے میں مدغم ہوگئی ہیں وہ دورِ جدید کا شاعر ہے اور آنے والے انقلاب کی ہنگامہ خیزیوں کا علمبردار!

کرشن چندر ایم۔ اے

دیباچہ

(از محترمہ مس نوّاب ذکیہ سلطانہ صاحبہ زکیؔ - مراد آبادی)

میرے محترم بھائی الطاف مشہدی صاحب کا ارشاد ہے کہ میں ان کے مجموعۂ کلام " تصویر احساس" کا دیباچہ لکھوں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ ایسا مضمون کس طرح معرضِ تحریر میں لاؤں ۔جو" تصویر احساس "کے سحر نگار اور شہرہ آفاق مصنّف کی بلند خیالی و لطافتِ بیان کے سامنے پست نہ معلوم ہو اور وہ طاقت اپنے خامۂ ناچیز میں کہاں سے لاؤں جو میرے خیالات میں اس یگانۂ دہر شاعر کی دلنشیں شیریں بیانی کے ساتھ بے جوڑ نہ بنائے۔کیونکہ مجھے اپنی کم علمی اور ہیچ میرزی کا پورا پورا احساس ہے۔اور اچھّی طرح سمجھتی ہوں کہ میں ابھی اس قدر قادر الکلام شاعر کے دیوان کا مجموعہ لکھنے کے قابل نہیں لیکن تعمیل ارشاد کی خاطر یہ جرأت کر رہی ہوں۔امید ہے کہ ناقدین میری خامیوں کو نظر انداز فرمائیں گے۔

شاعری کوئی ایسی چیز نہیں ۔جس کا ذکر کرتے وقت کسی تشریح کی ضرورت پیش آئے۔ یہ ایک ایسا جادو ہے ۔جس نے کائناتِ عالم کے ذرّہ ذرّہ کو مسحور کر رکھا ہے۔

ہندوستان میں بھی ایک ایسا زمانہ گذرا ہے۔ جب یہ فنِ لطیف قدر ومنزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اُس زمانہ میں بھی نازک خیال شعرا گذرے ہیں۔ جن کے کمال کا چاردانگ عالم میں ڈنکا بجا ہے اور جنکی بلند پروازی نے اُس وقت کی شاعری میں چار چاند لگا دئیے تھے۔ مگر یہ کمال کنگھی، چوٹی، کمر، دہن وغیرہ کی تعریف ہی تک محدود تھا۔ اور اسی پر طبع آزمائی کا انحصار۔ اور وہ زمانہ اس قسم کی شاعری کیلئے مناسب بھی تھا۔ اور اُس وقت ایسی شاعری کے قدردان بھی موجود تھے۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ فنِ لطیف عوام کے ہاتھوں میں آکر کچھ ایسا تباہ حال ہوا۔ کہ ہر کنجڑا اور حلوائی خود کو شاعر سمجھنے لگا۔ اس کے بعد زمانہ نے پھر پلٹا کھایا اور ایک نئی قسم کی شاعری شروع ہوئی۔ جو نیچرل اور قومی شاعری کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں مولینا حالی نے سب سے زیادہ حصّہ لیا اور اسی بنا پر ان کی کتاب مسدّس حالی بہت مقبول ہوئی۔ مگر یہ شاعری بھی مقبولِ خاص وعام نہ ہو سکی۔ کوئی پرانی شاعری کا دلدادہ رہا۔ کوئی نئی شاعری کا والہ وشیدا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ شعرا دو حصّوں میں منقسم ہوگئے۔ اور کوئی طاقت انہیں ایک راہ پر نہ لا سکی اور لا بھی کیسے سکتی تھی۔ جب تک کہ ایسی شاعری کی بنا نہ ڈالی جاتی جو پرانی اور نئی شاعری کے بین بین ہو اور جس میں پرانی اور نئی شاعری دونوں کی جھلک موجود ہو۔ اور یہی وہ واحد طریقہ ہے۔ جس سے دونوں قسم کی شاعری کے دلدادہ ایک راہ پر جمع ہو سکتے تھے اور اِس زمانہ میں اِسی قسم کا شاعر، شاعر کہلانے کا مستحق اور دنیائے شاعری پر آفتاب کی مانند جگمگا سکتا

ہے اور یہ تیسری قسم کی شاعری ہے۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہیں اور ہر شاعر اس کا اہل نہیں ایسی شاعری کیلئے خاص طبائع درکار ہیں۔ جن میں آورد کی بجائے آمد کی قوت موجود ہو۔ اور جو رزم و بزم، حسن و عشق، سین اور سینری کو اس خوبی سے پیش کر سکیں کہ نقل کو اصل کر دکھائیں۔ میرے سامنے اس وقت حضرتِ الطاف کے کلام کا کچھ حصّہ موجود ہے۔ جو عنقریب "تصویر احساس" کی صورت اختیار کرنے والا ہے۔ آپ کے کلام کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ الطاف صاحب ہندوستان کے مایۂ ناز اور قابلِ فخر شاعر ہیں۔ اور جو تعریف لوگوں کی زبان سے سُنی گئی تھی۔ آج نظموں کے مطالعہ سے حقیقت ثابت ہوئی ہے۔ آپ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں جان ڈال کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کے کلام میں بہترین اور کارآمد شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ ہر مضمون دلکش اور اعلیٰ پایہ کا ہے۔ بندش اور زبان کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جس سے ہر شعر بلکہ مصرعہ میں لطافت پیدا ہو گئی ہے۔ آپکی ہر نظم کے پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہم سنیما حال میں فلم دیکھ رہے ہیں الطاف صاحب کی نظم "پردیسی اور ہوا کا جھونکا" کے مطالعہ سے ممکن نہیں۔ کہ آپ دل کو قابو میں رکھ سکیں۔ کس قدر درد بھری داستان ہے۔ ایک ایک شعر سوزِ دروں کا آئینہ دار ہے۔ ایک سوختہ ساماں کی شرر بار آہیں ہیں ایک غریب الوطن کی بے چینی اور حب الوطنی کی مکمل تصویر ہے۔ جو طبیعت کو بیچین کر دیتی ہے۔ اس نظم کا لُطف کچھ وہی لوگ خوب حاصل کر سکتے ہیں۔ جنکو پردیس میں وطن کی یاد کا

تجربہ ہے۔ نظم کیا ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ میں نے اس نظم کو بار بار پڑھا اور چاہا کہ کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کر دوں۔ مگر ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ مجموعہ ہی میں نظم پڑھنے کی درخواست کی جائے۔ ایک غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں ؎

ہماری نگاہوں میں ہو گر جوانی
بدل ڈالیں خوابوں سے دنیائے فانی

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں ؎

زباں تھک گئی تو محبّت کا قصّہ
سُنانا پڑا آنسوؤں کی زبانی

اب دونوں شعروں کو پڑھئے۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیجا الفاظ کے استعمال سے کس قدر پرہیز کیا گیا ہے۔ اور کس طرح نہایت پیاری اور میٹھی زبان میں قدیم اور جدید شاعری کو یکجا کیا ہے۔ اسی طرح " آہوں کی بستی " نظم ملاحظہ ہو۔ اس میں بھی نئی اور پرانی روش کی جھلک موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہاں آبادیاں برباد ہیں ہر سُو فضاؤں میں
یہاں غمگینیاں کروٹ بدلتی ہیں ہواؤں میں

یہاں ہر پھول کانٹے کی طرح خونخوار ہوتا ہے
یہاں دہقاں زمیں میں بھروسی کا بیج بوتا ہے

مقدر پر یہاں مایوسیوں کی حکمرانی ہے
بڑھاپے کا گماں ہوتا ہے جس پر وہ جوانی ہے

ہر شعر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے جس کا لطف اُس کے پڑھنے پر منحصر ہے۔ حضرتِ الطاف مشہدی انقلابی نظموں میں اس قدر بلندی پر نظر آتے ہیں کہ ہماری نظروں کو آپ پر چاند یا سورج کا دھوکا ہوتا ہے۔ المختصر حضرتِ الطاف مشہدی کو مبداءِ فیّاض نے ایک دردمند دل ایک شعلہ بجاں فطرت اور ایک آتش افروز تخیّل عطا فرمایا ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ ہندوستان بھر میں سوائے جوش اور الطاف کے ایک بھی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس پر سرزمین ہند کو فخر ہو۔ کہ اُس نے بھی کچھ مایہ ناز اور باکمال ہستیوں کو پیدا کر کے بھوک کے مارے ہندوستانیوں پر احسان عظیم کیا ہے۔

خاکسار ذکیہ سلطانہ زکی مراد آباد

۲۴-جنوری ۳۹ء

ہدیۂ تشکر

"تصویرِ احساس" شائع ہوکر اربابِ نظر کے پاس پہنچ رہی ہے اسکی اشاعت میں متذکرہ ذیل اصحاب نے جو گرانقدر اعانت کی ہے۔ اس کٹھن منزل میں میری دستگیر ثابت ہوئی ہے۔ اسلئے میں بخلوصِ دِل شکر گزار ہوں۔

ع گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ابوالبرکات حضرت سیّد محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلالپور شریف امیر حزب اللہ

میرے محترم بزرگ اور گمراہوں کے رہنما ہیں۔ آپ ایک عظیم المرتبت قائد، حضرت طریق پیشوا اور تحریک حزب اللہ کے امیر ہیں۔ اسلامی دنیا میں حضرتِ مکرّم کا اسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی اصلاحی اور تنظیمی مساعی جمیلہ ملّت کیلئے باعثِ ناز ہیں اور واقعتاً آپ کی یہ مقدّس کوششیں قوم کیلئے زندگی بخش ثابت ہوئی ہیں دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت میں حضرتِ ممدوح نے جس انتھک مخلص اور بے پایاں محنت سے کام لیا ہے وہ ایک عالم سے خراجِ عقیدت حاصل کر چکا ہے۔

ان تمام مشاغل کے باوجود آپ ادبِ اردو کے محسن سرپرست ہیں۔ اور الحمد اللہ کہ آپ کی نوازشات ابتدا سے میرے شریکِ حال رہی ہیں۔ "تصویرِ احساس" کی اشاعت

میں آپ کی نظرِ التفات خاص طور پر شامل ہے۔

علّامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی

زبانِ اُردو کی ناؤ کے کھویا، علمِ اُردو کے علمبردار اور آسمانِ ادب کے درخشاں آفتاب ہیں۔ پیرانہ سالی میں جس جوان ہمّتی کے ساتھ آپ زبانِ اُردو کی حفاظت کر رہے ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے قابلِ صد تحسین و آفریں ہے۔ علّامہ موصوف کی ذاتِ گرامی کے ساتھ اردو کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ آپ نے "تصویرِ احساس" پر ایک مبسوط مقدمہ سپردِ قلم فرمایا ہے اور آپ جیسے محسن بزرگوں کی حوصلہ افزائی ہی سے میں اس منزل میں قدم رکھ رہا ہوں۔

علّامہ محوی صدیقی لکھنوی لیکچرار مدراس یونیورسٹی

آپ اُردو کے مراکز سے دُور تر مقام پر زبانِ اُردو کی ترویج میں کوشاں ہیں اور آپ کی ضَو باریوں سے مشتاقانِ اُردو کی ایک معتدبہ جماعت بہرۂ وافر حاصل کر رہی ہے مدراس جیسے غیر ادبی خطّہ میں آپ کا وجودِ مکرّم مغتنمات سے ہے اور ادب اردو کیلئے فالِ نیک

علّامہ تاجور نجیب آبادی

لاہور کی ادب آفرین سرزمین کے مُمتاز اُستاد اور سرمایۂ اُردو کے مایۂ ناز گوہر ہیں

آپ کی مسلسل مساعی حیاتِ اُردو کی ضامن ہیں۔ اور یقین غالب ہے کہ نجیب آباد کے اس عالم کا نام دنیائے ادب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہیگا۔

خان بہادر نواب چوہدری فضل علی صاحب ایم ایل اے گجرات (پنجاب)

ضلع گجرات کے سربرآوردہ راہنما ہیں آپ نے علاقہ کی تعلیمی پسماندگی کو دُور کرنے کیلئے بیش بہا مساعیٔ جمیلہ سرانجام دی ہیں۔ آپ زمینداروں کی تنظیمی، جماعتی اور اصلاحی تحاریک کے روحِ رواں اور عوام کے مخلص اور معتمد علیہ قائد ہیں۔ نواب ممدوح نہ صرف میرے کرمفرما ہیں۔ بلکہ ہمارے خاندان سے آپ کے دیرینہ مراسم چلے آتے ہیں۔

راجہ غضنفر علیخان صاحب ایم ایل اے پارلیمنٹری سیکرٹری حکومت پنجاب

آپ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ پنجاب کی مجلسِ آئین ساز کے ایک دیرینہ رکن اور شعلہ بیاں مقرر ہیں۔ آپ عرصۂ دراز سے ملک و ملت کی بے لوث اور مخلص خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اہالیٔ پنجاب بجا طور پر آپ کی ذاتِ ستودہ صفات پر ناز کرتے ہیں۔

میجر ملک خان محمد خانصاحب رئیس اعظم لائلپور

سپاہی نژاد لیکن ادب نواز ہیں۔ آپ لائلپور کی تمام اصلاحی اور مجلسی تحریکوں کے رکن

رنگین اور ادب اُردو کے سرپرست ہیں آپ ہر نازک مرحلہ پر ملت کی دستگیری کرتے ہیں اور قومی و ملی سرگرمیوں کے رُوحِ رواں ہیں۔

قریشی عبداللہ شاہ صاحب وکیل سرگودھا

آپ بذلہ سنج، نکتہ رس دیدہ ور فاضل اور کامیاب وکیل ہیں سرگودھا کی علمی، ادبی محفلیں آپ کے دم سے ہی سانس لے رہی ہیں۔ میرے نہایت مہربان اور مخلص دوست ہیں۔

چوہدری عطا محمود خانصاحب رئیس بکہ ماڑی

آپ سرگرم نوجوان، رئیس ابن رئیس، ادیب نواز اور مخلص دوست ہیں آپ ملی تحریکوں میں پُرجوش حصہ لیتے ہیں ؏

اللہ کرے زورِ عمل اور زیادہ

چوہدری منظور احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی سیکرٹری میونسپل کمیٹی لائلپور

آپ زبانِ اُردو کے مایۂ ناز شاعر اور شباب افروز سخنور ہیں آپ کی منظومات واقعی فردوسِ گوش ہیں اور طول و عرضِ ملک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ میرے عزیز ترین دوست ہیں اور اس پر مجھے ناز ہے۔

نواب مسز ذکیہ سلطانہ صاحبہ نیر زکی (مراد آباد)

آپ مشاق ناظمہ اور قابلِ فخر ناثرہ ہیں۔ زبان شُستہ اور حد درجہ سلجھی ہوئی ہے آپ نے از راہِ کرم "تصویرِ احساس" پر ایک دیباچہ بھی تحریر کیا ہے جس کیلئے میں آپ کا حد درجہ شکر گذار ہوں۔

کرشن چندر ایم۔ اے

آپ ہندوستان کے مایۂ ناز افسانہ نگار ہیں۔ ایک قلیل عرصہ میں آپ نے میدانِ ادب میں غیر فانی شہرت حاصل کر لی ہے۔ موصوف نے "تصویرِ احساس پر ایک پُر مغز دیباچہ لکھ کر مجھے مرہونِ احسان کیا ہے۔

میاں محمد حنیف صاحب مہتمم اردو اکیڈمی پنجاب (لاہور)

آپ تجارتی دنیا کے ایک معزز فرد ہیں اور اشاعتِ ادب میں گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بہترین لٹریچر کا شیوع آپ کا مطمع نظر ہے۔ دُعا ہے کہ خدائے قدوس آپکو ان مبارک ارادوں میں بوجوہِ احسن کامیاب کرے "تصویرِ احساس آپکی کوششوں سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے حنیف صاحب کے چھوٹے بھائی میاں عبدالرحمن صاحب نے "تصویرِ احساس" کی اشاعت میں میری گرانقدر امداد کی ہے جسکے لئے میں آپ کا بیحد ممنون ہوں:

مجید امجد بی۔ اے مدیر عروج جھنگ

جھنگ کی رُومان خیز سرزمین کے رومانی شاعر اور خوش فکر نوجوان ہیں میرے مخلص دوست اور بہی خواہ آپ نے "تصویرِ احساس" کی تدوین میں میری قابلِ قدر امداد کی ہے

خان سکندر علیخان صاحب حامی جھنگ

آپ کامیاب افسانہ نگار اور خوش فکر شاعر ہیں۔ میرے عزیز دوستوں میں سے ہیں اور آپ کی امداد کا میں حد درجہ ممنون ہوں۔

خلیق قریشی لائلپور

آپ ایک اعلیٰ پایہ کے نقّاد اور سخنور نوجوان ہیں۔ میرے نہایت عزیز دوست ہیں "تصویرِ احساس" کی ترتیب و تدوین میں آپ نے مجھے گرانقدر امداد دی ہے۔

راجہ خیر مہدی خان جنجوعہ رئیس ڈسٹرکٹ سرگودہا

آپ ضلع شاہپور کے رئیس اعظم اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے شعلہ بیان رکن ہیں آپکی ذات سے میری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

اخلاص کیش

الطاف

۲۰۔ مارچ ۱۹۳۹ء

دُعا

قاضی الحاجات اہم کو بھوک سے کر دے نڈھال
ہو مصائب کی فراوانی سے جینا تک محال
صورتِ شعلہ بھڑک اٹھیں زمین و آسماں
پیاس کی شدّت سے نِکلے ہوں ہمارے پنجاں
راکھ کر دے خرمنِ ہستی کو برقِ شعلہ زا
آسماں سے بوندیوں کے بدلے برسیں اژدہا
صورتِ منصور سُولی پر بھی کھنچوانا ہمیں
ہو اگر خواہش تو انگاروں پہ تڑپانا ہمیں
دست و پا شل ہوں نظر بیکار اور دِل ہو فگار
موت سینے سے لگانے کے لئے ہو بیقرار

بن کے خنجر کاٹ ڈالے آرزوؤں کا گلا!
آ رہی ہو صحنِ گلشن سے جو بادِ جانفزا
مضطرب آنسو ہوں آنکھوں میں لبوں پر ہو کراہ
زندگانی پر ہماری موت کا ہو اشتباہ
آبِ دریا ہو لہو یہ بھی ہمیں منظور ہے
ہو غضب آلود تو یہ بھی ہمیں منظور ہے
قاضی الحاجات! لیکن اس دعا کو دے اثر
گر پڑیں طوقِ غلامی گردنوں سے ٹوٹ کر

میرا پیار

میں ایسی جُرأتوں کو چاہتا ہوں پیار کرتا ہوں

جو ماؤں کو کریں مجبور یہ آواز دینے پر
مرے نورِ نظر! جامِ شہادت جلد خالی کر
عروسِ نو کے دل میں جو کریں یہ آرزو پیدا
مرے شوہر کا خوں کر دے خزاں میں رنگ بو پیدا
جو ہمشیرہ کو کر دیں یہ دُعا دینے پر آمادہ
مرا بھائی ہو سینے میں اَنی لینے پر آمادہ
جوانوں کو کریں مجبور جو میداں میں آنے پر
جگر کی قاش کے خنجر سے باطل کو جھکانے پر
جو ہونٹوں کو اُبھاریں اس طرح تقریر کرنے پر

کہ تُل جائیں جواں عریاں لبِ شمشیر کرنے پر
جو آنکھوں کو کریں خونیں مناظر کے لئے بیکل
جو چھاتی کو کریں نوکِ سناں کیواسطے پاگل
جو سینے کو عطا کر دیں وطن کی چاہ کی سوزش
جو شاعر کے تخیّل میں بھریں اُس آہ کی سوزش
کہ جس سے قصرِ استبداد کی بنیاد ہل جائے
مرے اُجڑے ہوئے ہندوستاں میں پھر بہار آئے
میں ایسی جرأتوں کو چاہتا ہوں پیار کرتا ہوں

شرم

شرم اُس افلاس کو جو پائے دولت پر جھکے
شرم اُس تلوار کو جو جسمِ دشمن میں رُکے
شرم خنجر کو نہ چومے جو گلا مغرور کا
شرم مے نوشی کو نہ اُترے گر نشہ مخمور کا
شرم اُس قوّت کو جو تقدیر کی ہو معتقد
شرم اُن زندانیوں کو جن کو آزادی سے ضد
شرم اِنساں کو جو ڈر سے صورتِ سیماب ہو
شرم گردن کو جو خم کے واسطے بیتاب ہو
شرم لب کو جو خوشامد کے لئے ہو بے قرار
شرم مردوں کو جنہیں ہو رحمتوں کا اِنتظار

شرم ہاتھوں کو اٹھیں جو بہبودِ مزدور پر
شرم اُن تیروں کو بیٹھیں جو لبِ ناسور پر
شرم اُس اُٹھتی جوانی کو جو کانپے دیکھ کر
لوتھڑوں کا رقص صحراؤں کی تپتی ریت پر
شرم دِل کو جس میں ہو غداریوں کی پرورش
شرم دِل کو جس میں ہو عیّاریوں کی پرورش
شرم آنکھوں کو بچھیں جو اہلِ زر کی راہ پر
شرم اشکوں کو بہیں جو اہلِ زر کی آہ پر
شرم اُس شاعر کو جس کی قوم کا یہ حال ہو
آرزوؤں کی جبیں کھیتی تلک پامال ہو
شرم تم کو نوجوانانِ وطن یہ زندگی
بن رہی ہے سر سے لیکر پاؤں تک شرمندگی

لمحاتِ آزادی

گھٹاؤں کے سابیوں کی مستی سی بڑھکر
فرشتوں کی پاکیزہ ہستی سے بڑھکر

حسیں بربطوں کے ترنّم سے پیارے
لبِ دلنشیں کے تبسّم سے پیارے

وطن کے حسینوں کے ناموں سی میٹھے
نگاہوں کے پُر کیف جاموں سی میٹھے

محبت کے آوارہ راگوں سے پیارے
سلیمیٰ کی زلفوں کی ناگوں سی پیارے

ستاروں کے پُرنور بستر سے دلکش
مہ و مہر کے سیمگوں گھر سے دلکش

بہاروں کی اٹھتی جوانی سے شیریں
مری عاشقی کی کہانی سے شیریں

وہ لمحات گذریں جو آزادیوں میں

وہ اوقات گذریں جو آزادیوں میں

انقلاب

تابکے دامِ غلامی کے اسیرِ وبہ حجاب
تابکے مردانگی کے رُخ پہ ذِلت کی نقاب
تابکے تقدیر کے تاروں پہ افرنگی سحاب
اُٹھ کے دیکھو تمنّوں سے کہہ رہا ہے اضطراب
اِنقلاب وا اِنقلاب وا اِنقلاب وا اِنقلاب

زلزلے، طوفان، بادل، آندھیاں، بجلی، شرار
سنبر، بچھو، ناگ، ہاتھی، بھیڑیے، آسیب، مار
دشت، ٹیلے، ندیاں، سبزہ، سمندر، آبشار
کہہ رہے ہیں تلملا کر سب با چشمِ غضب
اِنقلاب وا اِنقلاب وا اِنقلاب وا اِنقلاب

آستینوں کو چڑھا کر کھینچ کر تیغ و سناں
موت سے آنکھیں ملا کر خنجروں کے درمیاں
گولیوں کو گھور کر اعدا کو کر کے نیم جاں
ہند کو کر دو مہکتے خلد زاروں کا جواب
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

کھنکھناتی برچھیوں کے زمزموں پر جھوم کر
دندناتی توپ کے برقی دہانے چوم کر
کھلکھلاتی بجلیوں کی سیڑھیوں پر گھوم کر
لیلیٰ مغرب کے چہرے سے الٹ ڈالو نقاب
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

ہند کے دہقان کا حامی، ضعیفوں کا عصا
بیکس و ناچار مزدوروں کا واحد آسرا

غم نصیبوں کے لئے تقدیر کا جلتا دیا
ہے اگر کوئی تو دنیا میں فقط اِک انقلاب
ہے اسی کی تہ میں پوشیدہ مقدّر کا شباب
ہاں ذرا پھر انقلاب و انقلاب و انقلاب

قومی ترانہ

اے مرے ہندوستاں جنّت نشاں

بہہ رہی ہیں تیرے سینے پر وہ شیتل ندیاں
کھیلتا ہے جن کی لہروں پر سروروں کا جہاں
جُھومتا ہے جن سروں میں شبابِ جاوداں
پاسبانی جن کی کرتا ہے ہمالہ سا جواں

اے مرے ہندوستاں، جنّت نشاں
تیرے باغوں کی لہک سے جھانکتی ہے زندگی
زندگی وہ موت کو بھی جس سے ہو شرمندگی
جس سے حاصل ہو حریمِ رُوح کو تابندگی
خلد زاروں کا ہے تیرے گلستانوں پر گماں
اے مرے ہندوستاں جنّت نشاں

تیرے پربت سیم و زر کا گنگناتا آبشار
تیرے چشمے بربطِ ناہید کا زرّین تار
تیرے جنگل خُلد کے سینے کی سُندر سی بہار
مست جھونکوں کی زباں پر مدھ بھری موسیقیاں
اے مرے ہندوستاں جنّت نشاں

تیری مستانہ ہواؤں میں جوانی ضو فگن

ذرّے ذرّے سے نمایاں طُور کا سا بانکپن
مسکراتی ہے فضاؤں میں نشیلی سی پھبن
تیری وادی میں سرور وکیف کی نہریں رواں
اے مرے ہندوستاں، جنّت نشاں

بامِ آزادی کے خوش انجام زینے کے لئے
تیری اُلفت کے نشیلے جام پینے کے لئے
یعنی تیری گود میں آزاد جینے کے لئے
بجلیاں بنکر گرینگے غیر پر ہم ناگہاں
اے مرے ہندوستاں، جنّت نشاں

مزدور بیوہ

اک جمیلہ مانئ قدرت کا بلا ثانی کمال
لب پہ شکوہ اور دِل میں گھر اُجڑنے کا ملال

عبرتیں ہر دل کے کاشانے میں چونکاتی ہوئی
زندگانی کی روش پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی

موت کے جانسوز سورج کی کڑکتی دھوپ میں
رحمتوں کو دیکھکر خونخواریوں کے رُوپ میں

کہہ رہی تھی، اے خدا! تیرا طلسم بیکراں
توڑتے ہیں دیکھ کیسے بھُوک کے مارے جواں

کس طرح تیری ربوبیّت کا رعب بے پناہ
چھینتے ہیں آہنیں ہاتھوں سے ہم خانہ تباہ

کس طرح تیری خدائی کی ردائے زرنگار
لیتوا مزدور کرتے ہیں جھپٹ کر تار تار

کس طرح تیرے نظامِ سیم و زر کی آبرو
تھوکتی ہے دیکھ کر افلاس زادوں کو لہو

حد سے جب بڑھنے لگا مزدورِ بیوہ کا عتاب
تو کیا یوں اس سے میں نے جوش میں آ کر خطاب

ہوش میں آ ہوش میں اے مفلسی کے شاہکار
راکھ کر دینگے تجھے قہرِ الٰہی کے شرار

اُس شہِ کون و مکاں کی شان میں گستاخیاں
جس کے ہاتھوں میں نظامِ کائناتِ دو جہاں

روزِ محشر جسکے اِک ہلکے غضب کا نام ہے
جس کے ہاتھوں میں قضا کی تلخ مے کا جام ہے

سن کے گرجی اور گرج کر اس طرح کہنے لگی
گفتگو کے تیز رَو دھارے میں یوں بہنے لگی

اے جواں اے اعتقادوں کے سلاسل کے اسیر
کاش چہرے سے اُلٹ سکتا ردا تیرا ضمیر

شکر اور الحمد کا دے دے کے ہر ساعت خراج
تیرے جیسوں ہی نے خالق کا بگاڑا ہے مزاج

کس طرح مانوں میں ایسے "قاضیٔ حاجات" کو
خونِ بیکس کی حنا سے جو سجائے ہات کو

اس لئے مانوں کہ میری نوجوانی کی بہار
دم زدن میں اُس نے کر دی ہے خزاں سی ہمکنار

اس لئے مانوں کہ میرا زندگی بھر کا رفیق
مونس و غمخوار و ہمدرد و بہی خواہ و شفیق

بیکسی کے زرد ہونٹوں کا پیالہ بن گیا
موت کے خونِ خوار جبڑوں کا نوالہ بن گیا

لیکن اس پر بھی میں شکر اُسکا بجا لاتی رہی
دِل کے زخموں پر ستم کی برچھیاں کھاتی رہی

آج لیکن ہو گئی جور و ستم کی انتہا!
آہ میرا لال میری زندگی کا آسرا

پاس ہی لیٹا ہوا تھا اوڑھ کر چادر مری
جس مکاں میں کر رہی تھی کام میں قسمت جلی

اینٹ دیتے وقت میرا ہاتھ کچھ تھرا گیا
زندگانی کی اُمیدوں پر اندھیرا چھا گیا

اینٹ بن کر موت کی بجلی گری معصوم پر
بیکسی کی سرخ آندھی چھا گئی مغموم پر

سُن کے رودادِ ستم یابِ حقیقت کھُل گیا
دِل بغاوت پر خدائے دو جہاں کی تُل گیا

غرُور

ایسے موقع پر ہے انساں کیلئے زیبا غرور

جب حکومت کا جنوں ہو آدمیت پر سوار
جب کوئی خودداریوں کا کھیلنا چاہے شکار
جب غلاموں کی پیاسی آنکھ دیکھے گھور کر
تُل گیا ہو جب کوئی جذبات کی تخفیر پر
جب سنانِ طنز سے مجروح ہوتا ہو وقار
جب کسی زردار کی آنکھوں میں ہو زر کا خمار

ؔ میرے نزدیک یہاں یلئے اوّل کی آواز جائز ہے ۔

پا کے جب مزدور کو آنکھوں نکلے آ گئے ناگہاں
قیصریت کے لبوں پر مسکراہٹ ہو عیاں
زر کی دیوی کے حسیں جلووں سی ہو کے ہمکناں
چاہتا ہو جب خوشامد کی غذا سرمایہ دار
جب کوئی پہچان کر بھی پیش آئے اس طرح
گھر کا مالک ہو مخاطب اجنبی سے جس طرح
ایسے موقع پر ہے انساں کیلئے زیبا غرور

غلام کی زندگی

الٰہی گر مجھے اس ہند میں کچھ روز جینا ہے

تو میری قوّتِ احساس مردہ ہو کے رہ جائے

دلِ خوددار بارِ ذلّتِ افلاس سہہ جائے

مرا سر آستانِ سیم و زر پہ جھک کے شاداں ہو

خوشامد کا مرے ہونٹوں کو پیتا بانہ ارماں ہو

مری فطرت پہ محکومی کے بادل سایہ افگن ہوں

مری قسمت پہ محرومی کے بادل سایہ افگن ہوں

جبیں کو سجدہ ریزی کی تڑپ بیتاب کر ڈالے

مرے اخلاص کو لالچ کی دیوی گود میں پالے

وطن کی راہ میں مرنے کے ارماں خودکشی کر لیں

وطن کی چاہ میں مرنے کے ارماں خودکشی کر لیں
مرے افکار دیں اہلِ وطن کو درسِ غدّاری
مرے ایثار کے ایوان میں ہو زلزلہ طاری
مجھے اِک کیف حاصل ہو یتیموں کے رُلانے میں
مرے دِل کو مزا آئے غریبوں کے ستانے میں
مری غیرت کی مشعل کپکپا کر سرد ہو جائے
مری مردانگی کا سُرخ چہرہ زرد ہو جائے
جبھی میں رہ سکوں گا شاد محکوموں کی بستی میں

ماتمی جلوس

یہ ساں رہا تھا شمس شرارے زمین پر
تھے موجزن پسینے کے دریا جبین پر

حدت فروش جھونکوں سے تھرا رہی تھی سانس
گرمی کے ڈر سے سینے میں گھبرا رہی تھی سانس

زرّیں ردا تھی لیلئ فطرت کے دوش پر
شعلوں کے جا بجا تھی ردا پر دُرّ و گہر

ایسے میں اک جلوس سراپا سیاہ پوش
خنجر بدست، خاک بسر اور علم بدوش

آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لئے ہوئے
سینے کو مثلِ صحنِ گلستاں کئے ہوئے

آتا تھا خوں سے سینچتا نخلِ رسول کو
وا کر رہا تھا خود پہ یوں بابِ قبول کو

دیکھا تو دل سے درد کا چشمہ اُبل پڑا
مجھکو مرے ضمیر نے الطاف دی صدا

شاعر! بنا حسین کے ہر نوحہ خواں کو
گر چاہتے ہو شانِ شہیداں کی آن کو

خودداریٔ حسین کا پیدا کرو جواب
اُڑ جائے جس سے چہرۂ باطل کی آب و تاب

لب پہ حسین، طوقِ غلامی گلے کا زیب
اسلامیو! خدا کو بھی دینے لگے فریب

مذہب تمہارا خام ہے ایمان خام تر — رونا تمہیں حرام ہے ہنسنا حرام تر
کشتی بھی بحرِ عمر میں کھینے کا حق نہیں — زندانیوں کو سانس بھی لینے کا حق نہیں

جینا ہے گر جہان میں جیو بن کے مردِ کار
یہ زندگی نہیں کہ ہو تم ننگِ روزگار

ماں کی دُعا

تیرے دم سے پھر وطن والوں میں پیدا ہو حیات
پنجۂ اغیار سے ہو ہند کو حاصل نجات

کام آجائے وطن کی راہ میں تیرا شباب
غیرتِ زندانیوں کی پھر اُلٹ ڈالیں نقاب

تو بدل ڈالے نظامِ ہند کے لیل و نہار

یہ غلام آباد ہو آزاد مُلکوں میں شمار
آستینِ ہند ہو تیرے لہو سے لالہ فام
بادشاہوں کا لقب پاتے لگیں ہندی غلام
ہڈیاں پس کر بنیں غازہ عروسِ ہند کا
حُسن پھر ہو جائے کچھ تازہ عروسِ ہند کا
ہو پسینے سے ترے روشن چراغِ انقلاب
مطلعِ مغرب پہ چھا جائے بلاؤں کا سحاب
تیرے ہونٹوں سے بوقتِ مرگ یہ نکلے صدا
نوجوانانِ وطن آگے بڑھو آگے ذرا
اے مرے سینے کی ٹھنڈک اے مری آنکھوں کی آب
بارگاہِ ایزدی میں یہ دُعا ہو مُستجاب

محبوبہ کی شرط

تمہارے ہجر میں مرنا قبول کر لوں گی　　غموں میں جی سے گذرنا قبول کر لونگی
شبوں کو درد کے دریا میں ڈوب جاؤنگی　　جگر کو سوز کے خنجر سے گدگداؤں گی
وفورِ گریہ سے آنکھیں خراب کر لونگی　　بہارِ زیست کو وقفِ عذاب کر لونگی
غموں کی ران پہ توڑیگا دم شباب مرا　　جلیگا آہ کے نغمات سے رباب مرا
کبھی سکھی کو کسی گود میں جو پاؤں گی　　جگر کو تھام کے چوکھٹ پہ بیٹھ جاؤں گی
کبھی جو کالی گھٹائیں فلک پہ چھائینگی　　تو بجلیاں سی رگ و پے میں دوڑ جائینگی
یہ سب درست کہ تڑپا کرونگی راتوں کو　　تمہارے ہجر میں آہیں بھرونگی راتوں کو

غرورِ غرب مگر جب تلک نہ شرمائے
دیارِ ہند میں جب تک نہ پھر بہار آئے

اسیرِ دامِ غلامی نہ ہوں رہا جب تک　　ملے نہ داغِ غلامی کا خوں بہا جب تک

شرابِ وصل کا اِک گھونٹ بھی نہ پاؤ گے
تڑپ تڑپ کے یونہی زندگی گنواؤ گے

ہندوستان

ہے مسکن ان وطنوں لطافت کا آہوں کی بستی ہیں
یہاں شب کو فلک پر اشکِ شمیں جگمگاتے ہیں
یہاں زخمِ جگر غنچوں کی صورت مسکراتے ہیں
یہاں گلشن میں آہِ شعلہ پرور چھپاتی ہے
یہاں بزمِ طرب میں جانکنی نغمے سناتی ہے
یہاں بربادیاں آباد ہیں ہر سو فضاؤں میں
یہاں غمگینیاں کروٹ بدلتی ہیں ہواؤں میں

یہاں ہر پھول کانٹے کی طرح خونخوار ہوتا ہے
یہاں دہقاں نہیں ہیں کج روی کا بیج بوتا ہے
مقدّر پر یہاں مایوسیوں کی حکمرانی ہے
بڑھاپے کا گماں ہوتا ہے جس پر وہ جوانی ہے
برستے ہیں یہاں نالوں کے لب سے سرخ انگارے
یہاں زہرہ جبینوں کے بھی تر رہتے ہیں رخسارے
سمجھتے ہیں یہاں ہر بوالہوس کو لوگ فرزانہ
محبّت کرنے والوں کو مگر کہتے ہیں دیوانہ
یہاں چاندی کے ٹکڑوں کے عوض کرتے ہیں رہی غدا
ریا کے آستانے پر یہاں جھکتی ہے خودداری
ہے مسکن ان فنوں اطاف کا آہوں کی بستی میں

غلامی

جو بجلی کی طرح گر کر نشیمن کو جلاتا ہے
جو اٹھ کر درد کی صورت شبوں کو خوں رلاتا ہے
جو سوزش کی طرح زخمِ دروں کو گدگداتا ہے
جو ٹیسوں کی طرح سینے میں خنجر سے چلاتا ہے
جو ذلت بن کے انسانوں کی نظروں سے گراتا ہے
جو بن کر قبر آغوشِ مصائب میں سلاتا ہے
وہ آزارِ غلامی ہے وہ آزارِ غلامی ہے

غلامی جس کا سایہ بھی پڑے تو خاک کر ڈالے
غلامی جس کا شانہ بھی لڑے ناپاک کر ڈالے
غلامی جو تصور میں بھی آئے تو جھلس ڈالے

غلامی پرورش پاتے ہیں جسکی گود میں نالے
غلامی جو نگاہوں سے لہو کو چوس لیتی ہے
غلامی جو لپک کر موت کا پیغام دیتی ہے
غلامی چھینتی ہے جو جوانوں سے جوانمردی
غلامی چھینتی ہے جو دلوں سے بڑھ کے ہمدردی
غلامی جو سبق نسوانیّت کا دے جوانوں کو
غلامی جو خوشامد سے کرے واقف زبانوں کو
غلامی جس نے گھر عشق و سکوں کے خاک کر ڈالے
غلامی پاک باطن کو بھی جو ناپاک کر ڈالے
غلامی جو تخیّل کو بھی پست و خوار کرتی ہے
غلامی جو دلوں میں ذلّتوں کا زہر بھرتی ہے
غلامی جو تغافل میں ڈبو دیتی ہے انساں کو

غلامی جو بجھا دیتی ہے دل سے شمعِ ایماں کو
اُسی کے سحر زا جلوؤں کی ضو میں کھوئے جاتے ہو
زمانہ جاگتا ہے، ہندیو! تم سوئے جاتے ہو

وصیّت

مزدور کی تصویر

چشمِ عبرت! آ دکھاؤں میں تجھے وہ سر زمیں
چومتی ہے جسکی چوکھٹ کو فرشتوں کی جبیں
خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں
ہے لہو سے جس کے رنگیں اہلِ زر کی آستیں
محنت و اندوہ و غم شام و سحر جس کی غذا

جگمگاتا ہے پسینہ بن کے بجلی کی ضیاءُ
جس کی ہے گاڑھی کمائی سود خواروں کیلئے
جس کی جانِ زار ہے سرمایہ داروں کیلئے
آہ یہ اُس شیر دِل مزدور کی تصویر ہے!
جس کے ہاتھوں رحمتوں کے باب کی زنجیر ہے!
ابنِ آدم جس کے باعث صاحبِ توقیر ہے
جس کی محنت اہل زر کے واسطے اکسیر ہے
آہ لیکن اُس کی ساری کلفتوں کا یہ مآل
ننھے بچّوں کو ملے نانِ شبینہ یہ محال

مزدور جمیلہ بسترِ علالت پر

موسمِ سرما کی شب سہمی ہوئی ہے کائنات
سو رہا ہے خامشی کی گود میں سازِ حیات

تیرگی کا دور دورہ ہے فضا ویران ہے
اہلِ زر کے گھر میں لطف و عیش کا سامان ہے

جھونپڑوں میں فاقہ کش مزدور ہیں کھوئے ہوئے
گویا اپنے ہی نصیبوں کی طرح سوئے ہوئے

اِک جمیلہ جس کا شوہر گھر سے کوسوں دُور ہے
اپنے بیکس لاڈلوں کو دیکھ کر رنجوُر ہے

چہرہ افسردہ تنِ نازک علالت کا شکار
دم لبوں پر اور آنکھوں میں کسی کا انتظار

مشعلِ راہ عدم ہیں سینۂ بریاں کے داغ
ہچکیوں پر آرہا ہے زیست کا دھندلا چراغ

تابِ گویائی زباں میں گو نہیں دِل میں مگر
کہہ رہی ہے کون لیگا اِن یتیموں کی خبر

آہ یہ نورِ نظر وجہِ قرارِ زندگی
جن کا اِک ہلکا تبسّم ہے مدارِ زندگی

آہ یہ نورانی چہرے ماند پڑ جائیں گے اب
ٹھوکریں کھا کھا کے بھٹکیں گے راستوں میں روز و شب

سوتے سوتے خواب سے جیسے چونک اٹھیں گے غریب
کون دیکھے گا انہیں اور کون سوئے گا قریب

کون ہوگا جو دھڑکتی چھاتیوں پر رات کو
رکھ کے سوئے مادرانہ شفقتوں سے ہات کو

کھیل کر آئیں گے یہ معصوم گھر میں جب کبھی
کس سے پوچھیں گے کہ کیا ابا نہیں آئے ابھی؟

کیا خبر کب کام سے باپ ان کا واپس آئیگا
اور بلکتے بیکسوں کو پیار سے سمجھائے گا

مزدور جمیلہ کی وصیّت

اے ہوائے تیرہ بختی اے پُرغم فضا
جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دِل نامِ خُدا
ان سے کہنا کر گئی ہے یہ وصیّت ماں تمہیں
اہل دولت نے ملایا خاکِ ذلّت میں ہمیں
تم طلسم انکا نہ توڑو گر تو جینا ہے فضول
نیند بھر سونا حرام اور کھانا پینا ہے فضول
ہاں اڑادو عیش کے متوالے انسانوں کی گرد
اور فلک سے باتیں کرنیوالے ایوانوں کی گرد
زورِ بازو سے بدل دو گردشِ ایّام کو
نوچ لو زربفت میں لپٹے ہوئے اجسام کو
کھینچ لو ان معصیت کاروں کی بینائی کا نور

توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور

بوٹیاں سرمایہ داری کی فضا میں چار سُو
اڑ رہی ہوں اور ٹپکتا ہو ہواؤں سے لہُو

مجھ کو خاکِ گور میں راحت ملے گی جب کہیں
ورنہ انگاروں کا بستر ہو گی تربت کی زمیں

ٹھوکروں سے سیم و زر کے بُت ملا دو خاک میں
تب مسرت کی چمک ہو دیدۂ نمناک میں

ہاں مٹا دو صفحۂ ہستی سے نامِ نابکار
ننگِ عالم ہے نہ رہنے پائے یہ سرمایہ دار

ہڈیاں جب تک چباؤ گے نہ زرداروں کی تم
گر دنیں جب تک اڑاؤ گے نہ زرداروں کی تم
قبر میں تڑپا کرے گی میری رُوحِ غم شعار

چونک چونک اٹھا کرتی نگی حسرتیں بے اختیار
کہنے پائی تھی یہیں تک وہ کہ شمع زندگی
موت کے مسموم جھونکوں سے اُلجھ کر بجھ گئی

شاعر کا خدا سے خطاب

اے خدا اے نعمتِ امن و اماں کے مدعی
وسعتِ رحمت تری اے بندہ پرور ہے یہی
اے خدا بندہ نوازی کیا اسی کا نام ہے
بس یہی مزدور کی محنت کا کیا انعام ہے
کیا اسی پر تو ہے رحمان و رحیمِ دو جہاں
کیا اسی پر ورد کرتے ہیں ترا خورد و کلاں

کیا یہی ہے تیری رزّاقی کی حدِّ اختتام
کیا یہیں پر جوش کھاتا ہے غضب نیر امدام

کیا اسی پر چھاؤں ہیں نارِ دل کی شب بھر غم نصیب
کیا اِسی پہ برف زا ٹھنڈی ہوائیں ہیں غریب

تیرے منظورِ نظر خونخوار کتوں کے لیئے
پیش کرتے ہیں لہو دل کا جگر کے لوتھڑے

کیا اسی منعموں کی ٹھوکریں سہتے ہیں یہ
کیا اسی پر رحمتوں کے منتظر رہتے ہیں یہ

کیا اسی حسنِ کرم پر تجھ کو کہتے ہیں کریم !
کیا اسی بل پر دکھاتا ہے انہیں نارِ جحیم

کیا یہی خونخوار ہیں ناز و نعم کے واسطے
اور یہ مزدور بیکس ہر ستم کے واسطے

ہیں سنہری قصر میں ارباب زر جلوہ فگن
اور یہ مزدور بیچارے اسیر صد محن

چھینتے ہیں کس لئے مزدور کے منہ سے طعام
کس لئے تو نے بنایا ہے انہیں ذی احتشام

کوئی حد بھی ہے یہ آخر تا بکے رنج و محن
سڑ رہی ہے جھونپڑی میں دیکھ نعش بے کفن

آہ دنیا میں نہیں ہمدم کوئی ایسا کہ جو
اشکباری میں یتیموں کا شریک حال ہو

آہ وقف بے کسی فطرت کا رنگیں شاہکار
حیف اے خونخوار دنیا حیف اے سرمایہ دار

اب کوئی دن میں چھلکنے کو ہے جام اضطراب
دیکھنے والی ہے چشم شوق دور انقلاب

فضائے آسمانی میں شاعر کا نالہ

شاعرِ آتش نوا کا نالۂ بے اختیار
عرش پر پہنچا ہوا کے دوش پر ہو کر سوار
لرزہ براندام تھے کرّوبیاں سن کر صدا
قاضی الحاجات خود حیران تھا یہ کیا ہوا
زلزلہ ہے آگ کا شعلہ ہے یا طوفان ہے
ذرّے ذرّے سے عیاں اک حشر کا سامان ہے
بڑھ گئی حد سے پریشانی فلک والوں میں جب
لے کے انگڑائی اثر بڑھنے لگا نالوں میں جب
عرض کی جھک کر ہوا نے خالقِ ارض و سما
ہے یہ اک اہلِ زمیں مظلوم انساں کی صدا

رات دِن سیلِ حوادث میں بہا کرتا ہے جو
داستاں مزدورِ بیکس کی کہا کرتا ہے جو
سن کے فرشتوں نے جوش میں آکر کہا
اے فلک کے رہنے والو ہوش میں آؤ ذرا
آہ اک ناپاک انساں کی مرے افلاک پر
حیف ہے صد حیف ایسی جرأتِ بیباک پر
کھینچ کر لاؤ زمیں سے بے ادب کو تم یہاں
تاکہ ٹوٹے اُس کی جرأت کا طلسم بیکراں
گونج اٹھی آسماں پر اک صدائے جاں رُبا
اور فلک سے اِک فرشتہ جوش میں نازل ہوا
دیکھتا کیا ہے کہ اک عصمت کی دیوی خاک پر
دیکھتی ہے دیدۂ پُر نور سے افلاک پر

منتظر ہے بیٹو اکب وہ خدائے ذوالمنن
بھیجتا ہے خلد سے میرے لئے زرّیں کفن

ماتمِ خاموش ہے گھر پہ مسلّط اس طرح
دُور ویرانے میں پردیسی کی تربت جس طرح

حسرتیں ہیں نعش بے گور و کفن پر نوحہ خواں
یاس کی مضراب تارِ اشک پر جیسے رواں

آتی ہے گھر کے جھرونکوں سے ہوائے پر فشار
چھیدتے ہیں بن کے جھونکے تیز تر خنجر کی دھار

ماں کی جانِ آرزو ، غربت کے پروردہ یتیم
ہاتھ اٹھا کر کہہ رہے ہیں موت دے ذاتِ کریم

گھر کی حالت دیکھ کر اندوہ گیں حسرت فضا
آبنولے کا غرورِ قدس بھی تھرّا گیا

ننھے بچّوں کو بنظرِ غور دیکھا اور کہا
آہ یہ تو اُس کے بچّے ہیں جو کل شب چل بسا
آہ یہ تو اسکے بچّے ہیں جو دستِ قہر سے
بھینٹ زرداری پہ چڑھ کر اٹھ گیا ہے دہر سے
آہ وہ مزدور پردیسی وہ جسمِ ناتواں !
جس کی کوڑوں سے اڑائیں ظالموں نے دھجیاں
یہ کہا اور غش کو ہاتھوں پہ لیکر اڑ گیا
اور چشمِ دہر سے پل مارتے غائب ہوا
اہلِ گردوں نے کیا پُر حشمت و شوکت تپاک
آسماں کی نوردِیدہ بن گئی وہ رُوحِ پاک
اس کے بچے درسِ عبرت ہیں زمانے کے لئے
منتظر سرمایہ داری جن کے کھانے کے لئے

ہندوستان سے خطاب

شرم اے ہندوستاں! ہے ڈوب مرنے کا مقام
دیکھ مزدوروں کے خوں سے اپنے ناوے لالہ فام

شرم اے غربت کے گھر محکومیت کی سرزمیں
پھٹ کے زرداروں کی ہستی کو نگلتی کیوں نہیں

آبدل دیں اُٹھ کے ہندی کی غلامانہ روش
آکچل دیں تند کے بندوں کو کہ مٹ جائے خلش
آکہ سفاکانہ فطرت ہی کو کر دیں ختم آج
آکہ دُنیا سے مٹا ڈالیں جفاؤں کا رواج

لائحۂ عمل

کسی کی آنکھ سے آنسو بہا کے چھوڑونگا
غرورِ حُسن کو نیچا دکھا کے چھوڑونگا

اگر یہ داغِ جگر کچھ دنوں سلامت ہے
جہاں کو وادیٔ ایمن بنا کے چھوڑونگا

کسی کی برقِ نگاہی سے طور والوں کو
دیارِ دوست میں بیخود بنا کے چھوڑونگا

سیاہ فام غلامی کا بدنما قشقہ
جبینِ ہند سے اِکدن مٹا کے چھوڑونگا

دلا کے یاد زمانے کو قصۂ غزنی
تمیزِ بندہ و آقا اٹھا کے چھوڑونگا

جہاں میں ربطِ محبت کی لہر دوڑا کر
بنائے رنج و کدُورت مٹا کے چھوڑونگا

جگا کے خواب سے بھارت کے ذرّے ذرے کو
جوابِ مطلعِ مغرب بنا کے چھوڑونگا

طلسمِ دہر میں الطافؔ خود کو گم کر کے
رُخِ حبیب سے پردہ اُٹھا کے چھوڑونگا

واسطہ

نوجوانو! تُم کو اپنی زِندگی کا واسطہ
مادرِ ہندوستاں کی بے بسی کا واسطہ

واسطہ ناکتخداؤں کے پھٹے ملبوس کا
واسطہ افلاس کے روندے ہوئے ناموس کا

واسطہ اُن آنسوؤں کا دیکھکر جن کو جواں
کُود پڑتے ہیں کڑکتی بجلیوں کے درمیاں

واسطہ اُن پھول سے گالوں کا تر رہتے ہیں جو
واسطہ ہونٹوں کا آہوں کی تپش سہتی ہیں جو

واسطہ بیواؤں کے سینوں سے اُٹھتی ہُوک کا
واسطہ زہرہ جبینانِ وطن کی بھُوک کا

واسطہ اُن کا کہ جنکی عزّتیں خطرے میں ہیں
پیٹ کے ناپاک ہاتھوں عصمتیں خطرے میں ہیں۔

واسطہ اُن کا کہ فاقوں کی بدولت جو غریب
ہو رہے ہیں موت کے خونخوار جبڑوں سے قریب

واسطہ بچّوں کا روتے روتے سو جاتے ہیں جو
روٹیوں کے بدلے ماں سے جھڑکیاں کھاتے ہیں جو

واسطہ اُن نرم ہونٹوں کا کہ جن پر وقت شام
گھومنے آتا ہے ٹھنڈی سِسکیوں کا اژدہام

بہ چھپیوں سے قیصرِ تبت کے جگر کو چیر کر
مادرِ ہندوستاں کی آبرو کی لو خبر

وطن آزاد کرنے کیلئے

ہند کا اجڑا انجمن آباد کرنے کے لئے
درد کے مارے ہوؤں کو شاد کرنے کیلئے
اک نیا عہدِ جواں ایجاد کرنے کے لئے
قصرِ استبداد کو برباد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

صفحۂ ہستی سے باطل کو مٹانے کے لئے
خرمنِ اعدا پہ اب بجلی گرانے کے لئے
اہلِ زر کی بیکسی پہ مسکرانے کے لئے
یعنی ارواحِ سلف کو شاد کرنے کیلئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

برچھیوں کے پھل کریں سرگوشیاں سینوں کے ساتھ
لومڑے کھیلیں غضب آلود سنگینوں کے ساتھ
گولیوں کا ہو تعارف دل کے آئینوں کے ساتھ

اِک جہانِ رنگ و بُو آباد کرنے کے لئے
جھُوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

کھِلکھلاؤ موت کی آندھی کو چلتے دیکھ کر
مسکراؤ آگ کے بادل مچلتے دیکھ کر
گنگناؤ خون کے چشمے اُبلتے دیکھ کر

اہلِ زر کو نذرِ برق و باد کرنے کے لئے
جھُوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

پھر سے بھڑکاؤ دلوں میں غیرتوں کی آگ کو

رزم کی جانب بڑھاؤ جرأتوں کی باگ کو
پاؤں کی نیچے کچل دو سیم و زر کے ناگ کو

زندگانی کو سراپا شاد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

مستیٔ صہبائے آزادی سے لہراتے چلو
ابر کی صورت بلند و پست پر چھاتے چلو
قہقہوں سے بلبلِ مغرب کو شرماتے چلو

پھر دیارِ ہند کو آباد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

قربانی

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن

سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں

فسوں نواز جوانی کی رازداں راتیں

گلے کو چومنے والی حسین تریں باہیں

دیارِ دوست کی مخمور و دلنشیں راہیں

گُلِ گلاب کی صورت گداز رُخسارے

لبوں میں کروٹیں لیتے سے شہد کے دھارے

شرابی آنکھ پہ چھائے ہوئے سیہ گیسو

گھٹا کی نرم ہتھیلی میں جیسے جام و سبو

کسی کی ہوش ربا و جنوں فروش نگاہ

ہماری پاک محبت کا اولین گنہ؟

وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کر دینگے

دیارِ ہند تجھے لالہ زار کر دینگے

خوشی سے جھومتا، گاتا، گرجتا آؤنگا

مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن

تہنیّت نامہ

(زہرہ کا خط شکیلا کے نام)

اے مری مُخلص شکیلا! رشکِ نسوانِ جہاں
آج ہر لب پر ہے تیری بیکسی کی داستاں

لوگ کہتے ہیں کہ کیا جینا ہے اُس معصوم کا
کمسنی میں گھر ہوا برباد جس مغموم کا

موت کے سفّاک ہاتھوں لُٹ گئی جس کی بہار
ہوگئی نے کردیا جس کو خزاں سے ہمکنار

جس کے سازِ زیست پر گایا گیا دیپک کا راگ
راکھ کر ڈالا اجل کی آگ نے جس کا سہاگ

بیکسی نے بڑھ کے جس کی زندگانی لوٹ لی

اور خزاں کے رہزنوں نے نوجوانی لوٹ لی
جس کی "امیدوں کا مرکز" جنگ میں مارا گیا
دِل کے ارمانوں کی آنکھوں کا حسیں تارا گیا
سُن کے یہ مژدہ خوشی سے جھومنے لگتی ہوں میں
پاؤں خوش بختی کے نیری چومنے لگتی ہوں میں
آہ لیکن ایک میں بھی ہوں کہ میری زندگی
بن رہی ہے سر سے لیکر پاؤں تک شرمندگی
آہ شوہر، میرا شوہر بُزدلی کی یادگار
عشرتوں کے پاؤں پر کرتا ہے جو سجدے نثار
شیشہ و پیمانہ جس کے مُونس و غمخوار ہیں
ناتوانی کے سبب بازو گلے کا ہار ہیں
تھرتھرا اٹھتا ہے جو سُنکر قضا کے نام کو

پوچھتا ہے جو وطن کے بدلے لیے کے جام کو

کاش ہر شوہر وطن کے نام پر قربان ہو
بیوگی محکومیت سے بھی کہیں آسان ہو
آہ لیکن بھوک کے مارے غلاموں کے ضمیر
آجتک ہیں خود فراموشی کے زنداں میں اسیر
آہ لے غیرت اسد زادوں کے شرمندہ شباب
آجتک محکومیت کی گود میں ہیں محوِ خواب
آج تک روتے ہیں جب لٹتا ہے کوئی آن پر
روحِ آزادی کو لیکن کھیلنا ہے جان پر
کاش لے آغوش میں مجھ کو بھی ہنس کر بیوگی
کاش مجھ کو بھی کہیں اہلِ وطن قسمت جلی
کاش میرے سائے سے بھی دلھنیں بچکر رہیں

کاش جل کے مُجھ کو بھی ڈائن مری نندیں کہیں

کاش رن ہو یہ کے شوہر کے لہو سے لالہ فام
ہو شہید دل میں مرے "جانِ تمنا" کا بھی نام

میرا شوہر بھی وطن کی آنکھ کا تارا بنے
مجھ کو تو پیارا ہے لیکن دیش کا پیارا بنے

زاہد!

ہٹا کے جام سے خالق پہ اب نگاہ کروں
جو عمر بھر نہ ہوا مجھ سے وہ گناہ کروں

جسے ازل سے ملی خودِسری کی تابانی
اسی جبیں کو میں سجدوں سے اب سیاہ کروں ؟

شراب و شاہد و شاعر سے جس کو نفرت ہے
میں ایسے "قاضیٔ حاجات" سے نباہ کروں ؟

نہیں، نہیں میرے زاہد یہ ہو نہیں سکتا
میں مر تو سکتا ہوں توقیر کھو نہیں سکتا

اے افلاس

رحم اے افلاس اب تاب و تواں مفقود ہیں
ہند کے اجڑے چمن میں نزہتیں نابود ہیں
تیرے دم سے کتنے معصوموں کی لاشیں بے کفن
جاں بلب ہیں بھوک کے آزار سے سیمیں بدن
روندی جاتی ہیں ترے پاؤں تلے خودداریاں
تیرے سائے میں ہوئیں پل کر جواں غداریاں
تونے اکسایا امیروں کو جبہ سائی کے لئے
حسن کو مجبور کر ڈالا گدائی کے لئے
لے کے آتا ہے غریبوں کے لئے تیرا شباب
آہ، نالہ، ٹیس، آنسو، چیخ، سسکی، اضطراب

تیرے ہاتھوں بک رہی ہیں عصمتیں بازار میں
صورِ اسرافیل کی تلخی تری گفتار میں

آگ کے بادل برستے ہیں تری آواز سے
خون کے چشمے اُبلتے ہیں وہاں سازسے

تیری ہر جنبش سے پیدا ظلم کا طوفان ہے
بینواؤں کے لئے جو موت کا سامان ہے

آہ اے افلاس تو نے کر دیا ایسا نڈھال
ہو رہی ہے ہندیوں پر زندگانی تنگ وبال

زبانِ اُردو

ہوشیار! اُردو زباں کے پاسبانو ہوشیار
تاک میں ہے خنجرِ اغیار کی مسموم دھار

لوگ بوسہ دیں عقیدت کا ہمارے ہات پر
تُل گئے ہیں چند غدّارِ وطن اس بات پر

ہے اگر اخلاص خدمت کا یہی لیل و نہار
ہو کے رہ جائے گا آزادی کا دامن تار تار

اس تمہاری خود فراموشی کو جب پا لینگے وہ
صفحۂ ہستی سے اُردو کو مٹا ڈالیں گے وہ

کب تلک چھائی رہیگی موت کی سی خامشی
کب تلک سوتے رہو گے زندگی ہے زندگی

دم زدن میں سونے والوں کو کچل دیتے ہیں یاں
کشتیٔ عمرِ رواں کو اس طرح کھیتے ہیں یاں
گنگناتے، اینڈتے، گاتے، گرجتے، جھومتے
لیلیٔ اردو کی بیکھی چیتونوں کو چومتے،
صورتِ اسلاف چھا جاؤ دیارِ ہند پر
پرچمِ اردو کو لہراؤ دیارِ ہند پر
اس طرح دینا پڑے گا زندگانی کا ثبوت
جذبۂ ایثار سے مملو جوانی کا ثبوت

تعارف

ہنسنے والے عظمتِ شاعر سے تو واقف نہیں
تیری آنکھوں میں جبھی یہ تمکنت ہے بالیقیں

آسمانوں پر یہ مہر و ماہ ہیں ضَو ریز جو
چشمِ شاعر ہی کے ٹپکائے ہوئے آنسو ہیں دو
قبر کی جانب ہو شاعر کا اگر رُوئے سخن
نعشِ صد سالہ بھی چہرے سے اُلٹ ڈالے کفن
نظمِ عالم رہ نہیں سکتا ہے جس دم برقرار
عرش پر ہوتا ہے میرے مشوروں کا انتظار
گنگنا کر قرنتیں بھر دوں دِلِ غمناک میں
زندگی کی لہر دوڑا دوں خس و خاشاک میں
میری تانوں میں وہ خونیں بجلیاں ہیں بیقرار
تھرتھرا اٹھتا ہے جن سے اہلِ مغرب کا وقار
گر قلم کے لب سے ٹپکاؤں جگر کا اضطراب
کروٹیں لینے لگے پیری کی رگ رگ میں شباب

میں اگر چاہوں تو ذرّے کو ضیائے مہر دُوں
موت کی آنکھوں سے بینائی کی قوت چھین لُوں

میرے نغموں کی تجلّی کا ہے وہ کافر شباب
جس کی ہر جنبش سے پیدا ہو جہاں میں انقلاب

میں اگر چاہوں تو پتھر میں لچک پیدا کروں
نو شگفتہ پھُول کے لب سے تبسم پیدا کروں

شب کو چھا جاتی ہیں جب نیندیں فضا پر چار سُو
خلد والوں سے کیا کرتا ہوں اکثر گفتگو

میری تحریروں میں بجلی آگ کا طوفان ہے
زر کے بندوں کیلئے جو موت کا سامان ہے

طُور کا جوبن مرے افکار کی قندیل میں
قدسیوں کا رقص میری محفلِ تخئیل میں

میرے اشعاروں میں ایسی قوتیں مستور ہیں
جن کے دامن پر وطن کی قسمتیں مسطور ہیں
معصیت زادے! تکبر کو ترے توڑوں گا میں
ٹھوکروں سے سیم و زر کے بت کا سر پھوڑونگا میں

بھکارن

ایک دوشیزہ بھکارن بھوک سے ہے بیقرار
خاک میں زلفیں اٹی ہیں پیرہن ہے تار تار
چھن رہی ہیں چیتھڑوں سے ہلکی ہلکی جھلکیاں
جیسے تاریکی میں تابندہ مناظر ضو فشاں
ہے لب لعلیں پہ بیکل آرزوؤں کا دفور

گردمیں لپٹا ہوا ہے عارضِ رنگیں کا نور
کروٹیں لیتی ہے شرمانوں میں یوں روحِ شباب
جیسے طوفاں خیز دریا میں شعاعِ آفتاب
آنسوؤں کے دھارے رخساروں سے مس کرتے ہوئے
مل رہے ہیں خاک میں حسنِ بصر کھوتے ہوئے
جا رہی ہے اہلِ زر کی مکنت کو بھانپتی
تھرتھراتی، کانپتی، گرتی، سنبھلتی، ہانپتی
دیکھ اے ہندوستاں "جنت نشاں زادوں" کا حال
ہو رہا ہے حسن کو اب بھیک تک ملنا محال
جس کو قدرت نے بنایا تھا حکومت کے لئے
چھوڑ رکھا ہے زمانے نے فلاکت کے لئے
آہ اے افلاس کے روندے ہوئے مفلس دیار
کمسنوں کی کمسنی یوں ہو رہی ہے تجھ میں خوار

مسلم سے خطاب

اے مسلماں صاحبِ توحید تھا دنیا میں تو
موجزن تیری رگوں میں تھا حمیت کا لہو

تو وضو کرتا رہا آبِ دمِ شمشیر سے
مٹ گئی ظلمت ترے ایثار کی تنویر سے

تو نے باطل کو مٹایا نعرۂ تکبیر سے
تو نے سوتوں کو جگایا نعرۂ تکبیر سے

تو نے سجدوں سے بسایا تھا کبھی اللہ کا گھر
خوں کے چھینٹوں سے سجایا تھا کبھی اللہ کا گھر

تیری غیرت کا تقاضا ہے کہ اٹھ بیدار ہو
لب پہ پھر اللہ اکبر ہاتھ میں تلوار ہو

دے اذانیں اٹھ کے یورپ کے کلیساؤں میں پھر
اور افریقہ کے شعلہ زار صحراؤں میں پھر

تو صنم خانوں کا اب دربان ہے ننگِ جہاں
تجھ میں اب غیرت کا بھی فقدان ہی ننگِ جہاں
تیرے آئینِ وفاداری میں ہے شامل کہ تو
خنجروں کے واسطے پیدا کرے تازہ لہو

مسلمہ!

مسلمہ! کچھ یاد ہے عہدِ کہن کی داستاں
ناز کرتے تھے تری ہستی پہ جب پیر و جواں

غیر کی نظریں ترے چہرے سے جب محروم تھیں
تیرے ماتھے پر وطن کی قسمتیں مرقوم تھیں

جوہرِ علمِ حقیقی سے تو بہرہ یاب تھی
آرزوئے خدمتِ اسلام سے بیتاب تھی

تیری ہستی باعثِ تسکین تھی شوہر کے لئے
وقف تھیں آرائشیں تیری فقط گھر کے لئے

کھیلتے تھے گود میں تیری کبھی شام و سحر
دیکھ کر جن کو عرق آتا جبینِ دہر پر

تیوروں میں جن کے ہمت، آنکھ میں سحرِ حلال
جن کے بشروں سے نمایاں سطوت و جاہ و جلال

غسل کرتے تھے لہو کی ندیوں میں رات دن
دل میں کچھ قدر جوانی تھی نہ کچھ پروائے سن

زندگی کا جن کی مقصد خدمتِ قوم و وطن
جو بدل دیتے تھے مظلوموں کی قسمت کی چلن

چومتی تھی جن کے قدموں کو جبینِ آفتاب
جو لپک کر موت کے رخ سے الٹتے تھے نقاب

جن کی تلواروں سے لرزاں تھی زمین و آسماں
جن کے برچھوں کی چمک سے کانپتی تھیں بجلیاں

شب کو سوتے تھے جو رکھ کر موت کے زانو پہ سر
مسکراتے تھے جو توپوں کے دہانے دیکھ کر

توڑتے تھے جن کے خنجر کجکلاہوں کا غرور
جن کی چوکھٹ پر مچلتا تھا جبینوں کا وفور

جن کے کہنے پر عمل کرتی تھی لیلائے حیات
دم زدن میں جو بدل دیتے تھے نظم کائنات

خندہ زن تھا گنبدِ افلاک پر جن کا شباب
ڈوبتا تھا جن کی پیشانی میں ہنس کر ماہتاب

جن کی مرہونِ کرم لیلیٰ تھی وہ محمل پرست
تھر تھرا اٹھتے تھے جن کے نام سے باطل پرست

جن کی قوت سے اسد زادے بھی لرزاں تھے کبھی
جن کے نعروں سے صنم خانے ہراساں تھے کبھی

آج تیری تربیت میں آہ وہ جوہر کہاں
دوڑتی تھیں جن سے بجلی کی رگوں میں بجلیاں

ہوش میں آ قوم کی قسمت کی مالک ہے خبر!
اب نوانِ آرائشوں کے ساز کو خاموش کر
آ بتاؤں تجھ کو تیری غفلتوں نے کیا کیا
نوجوانانِ وطن کے دل میں کیا کچھ بھر دیا
جن کے ہاتھوں پر حنا کاری لبِ شمشیر سے
اور گلے کی زیب و زینت آہنی زنجیر سے
جو بڑھا کرتے تھے تلواروں کے سائے میں درود
جھک گئے تیروں کی بارش میں بھی جو بہرِ سجود
عطر کے شیشوں سے وابستہ ہے اُن کی زندگی
اور پوڈر سے رُخ گلگوں کی ہے تابندگی
نیم عریانی سے تیری قوم عریاں ہو گئی
گود میں بحرِ حوادث کی سمٹ کر سو گئی

تیری ہستی کیا ہے اب اک عشرتوں کا ساز ہے
خرمنِ اسلام پر جو برقِ بے آواز ہے
اٹھ کہ اک طوفان اٹھا ہے مٹانے کے لئے
کشتیِ اسلام کو تہ میں سلانے کے لئے
تابکے یہ غفلتوں کی نیند ہو گی اور تو
اُٹھ کہ اب باقی نہیں ہے مجھ میں تابِ گفتگو
چونک اس خوابِ گراں سے دُھوپ سر پر آ گئی
قوم کے روئے حسیں پر مُردنی سی چھا گئی
جاگ اور گذرے ہُوئے ایام کو آواز دے
اٹھ کے پھر صیدِ حزیں کو قوّتِ پرواز دے

میدانِ جنگ کو جانے والے!

گنگناتی ہیں دعائیں ہو کے جھونکوں پر سوار
کروٹیں لیتی ہیں ہونٹوں پر دعائیں بار بار

مُسکراتا ہے ستاروں میں دعاؤں کا شباب
چاند کی کرنوں کا رُخ پر ڈال کر سیمیں نقاب

وجد میں ہے حسن کی لے خُود دعاؤں کا ستار
رقص کرتی ہیں شعاعِ مہر پر بے اختیار

سایہ افگن ہیں دعائیں کائنات ہوش پر
ہے دعاؤں کی ردا زنگینیوں کے دوش پر

میرے پہلو سے اٹھی ہیں جو دعائیں جھُوم کر
یہ تو پلٹیں گی اثر کی چشنونوں کو چوم کر

تیرے ہاتھوں میں شجاعت کے چھلکتے جام ہوں
تیری قوت سے اسد بھی لرزہ براندام ہوں

کامرانی کی جبیں چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہو
شادمانی کی جبیں چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہو

منزلِ مقصود آئے جبہ سائی کے لئے
اور شجاعت تیرے کوچے کی گدائی کے لئے

تیری آنکھوں میں سمٹے نظارۂ باغِ جناں
بھول جائے موت تیرے سامنے بیباکیاں

آسمانِ ہند پر بن کر قمر ضو ریز ہو
زندگانی کی ہر اک ساعت سرور انگیز ہو

تیری قوت سے بدل جائے لکھا تقدیر کا
عہدِ ماضی کو پھرے رُخ آسمانِ پیر کا

مجاہد اسلام ابوالبرکات حضرت سید فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلالپور شریف امیر حزب اللہ کے نام

اے کہ تو بادۂ توحید کا متوالا ہے
اے کہ تو گلشن اسلام کا رکھوالا ہے
شمع حریت و اخلاص کا پروانہ ہے
تیرا دل شیوۂ ایثار کا کاشانہ ہے
اے کہ ہے قوم کے گلشن میں جوانی کی بہار
اے کہ تو بوذر و سلماں کا ہے آئینہ دار
تجھ میں اسلاف کے اوصاف حمیدہ مضمر
تو ہے اسلام کے اخلاص و عمل کا مظہر
تیرے انوار سے سب ظلمتیں کافور ہوئیں

تیرے ایثار سے پھر جرأتیں معمور ہوئیں

تیری تقدیر ہے ڈوبی ہوئی نا نشتروں میں

تیری تسکیں ہے جھلکتی ہوئی شمشیروں میں

کشتیٔ قوم کو طوفاں سے بچانے والے

مرحبا ملّتِ بیضا کے جگانے والے

اٹھ کے پھر شمعِ صفت دل میں اجالا کر دے

خدمتِ قوم کی بیتاب تمنّا بھر دے

ہوا کے جھونکے کی تمنّا

الٰہی! نرم رخساروں کو چوموں یہ نہیں خواہش
بھٹکتی انکھڑیوں سے پی کے جھوموں یہ نہیں خواہش
نہیں خواہش کہ زلفوں کی گھٹاؤں سی لپٹ جاؤں
لبِ گلرنگ کی دلکش حلاوت کا مزا پاؤں
چمن میں گنگنانے کی تمنّا ہی نہیں مجھکو
کلی کو گدگدانے کی تمنّا ہی نہیں مجھکو
نہیں خواہش مئے الفت سے پھولوں کے شجر سینچوں
جوانی کے شرابی قہقہوں کو گود میں بھینچوں
میں گھبراتا ہوں چشمِ مست سے آنکھیں ملانے میں
میں شرماتا ہوں دوشیزاؤں سے نشانہ لڑانے میں

تمنّا ہی نہیں دامن حسیں چہروں سے الجھاؤں
نشیلے زمزموں کو شوق سے پلکوں پہ بٹھلاؤں
مجھے بھاتی نہیں اک آنکھ جلووں کی حسیں وادی
جواں لالہ ہو شش کن رنگین ناتمام آفریں وادی
مری نظروں میں عارض کی دمک بھی ہیچ ہے یارب
مری نظروں میں اعضا کی لچک بھی ہیچ ہے یارب
تمنّا ہے مجاہد کھیلتے ہوں جب شراروں سے
وطن کا نام چمکاتے ہوں شمشیروں کی دھاروں سے
میں بن کر سانس اُن کے آہنیں سینوں کو گرماؤں
حیاتِ جاودانی کا جہاں میں مرتبہ پاؤں!!

اے جوانی

جوانی! مری کیف پرور جوانی بہت مختصر ہے تری زندگانی
مگر اس میں بھی کام کرنا پڑیگا وطن کی محبت میں مرنا پڑے گا
اگر تجھ کو اپنے مشاغل ہوں پیارے ہوس، بیخودی، زمزمے، ماہ پارے
تو میری طرف سے اجازت ہے تجھ کو
بڑھاپا کہیں تجھ سے بہتر ہے مجھ کو

اقبال کا پیغام

برساتی تھی کل رات مری آنکھ ستارے
ہونٹوں میں مچلتے تھے غضبناک شرارے

جاں حدتِ افکار سے گھبرائی ہوئی تھی،
اک آگ کی آندھی تھی کہ لہرائی ہوئی تھی،

نشتر سے چبھوتا تھا کوئی قلب و جگر میں
اقبال کی بے وقت جدائی تھی نظر میں

ایسے میں سیہ فام گھٹا جھوم کے اُٹھی
اقبال کے جنت میں قدم چوم کے اُٹھی

چلنے لگیں خوابوں کے جزیروں کی ہوائیں
ہونٹوں میں لئے قلقلِ مینا کی صدائیں

آنکھوں نے خنک جھونکوں کو شرما کے صدا دی
کچھ نیند کی مے باقی ہے یا ساری لنڈھا دی
جھونکوں نے تھپک کر مجھے زانو پہ سُلایا
اور بہکی ہوئی لے میں کوئی راگ سُنایا
اُس راگ کی بدمست جوانی میں سما کر
آنکھوں کے جھپکتے ہی میں جا پہنچا فلک پر
کیا دیکھتا ہُوں نور کے دریا کے کنارے
بیٹھے ہیں جواں جبیں سے تکیوں کے سہارے
ہر سمت نظر آتا ہے بہکا سا ترنّم
ہر لب پہ چھلکتا ہے نشیلا سا تبسّم
ہر ساز میں نغمات کی مے جھوم رہی ہے
ہر آنکھ میں بدمست ادا گھوم رہی ہے

پھولوں کے جو بستر ہیں تو کلیوں کی ردائیں
اِک نیند سی برساتی ہیں مخمور ہوائیں
ہونٹوں میں لیے وصل کی راتوں کی کہانی
پیمانہ بکف پھرتی ہے حوروں کی جوانی
اِک حور سے ڈر ڈر کے کہا میں نے جواں سال!
اس وقت کہاں ہونگے بتا حضرتِ اقبال
اُس زہرہ جبیں نے مجھے رستے پہ لگایا
اور دُور سے ایوانِ غلامی بھی دکھایا
میں پیکرِ انوار کے دیدار کو پہنچا
اُس صاحبِ ایثار کے دیدار کو پہنچا!
کیا دیکھتا ہوں حضرتِ اقبال کھڑے ہیں
اور پاؤں میں بیچارے مسلمان پڑے ہیں

آداب بجا لایا میں گردن کو جھکا کر
اور عرض یہ کی درد کو سینے میں دبا کر
اے ہند کی اُجڑی ہوئی بستی کے کنھیا
اے سوئی ہوئی قوم کی کشتی کے کھوّیا!
میں آپ کی آنکھوں میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں
اشکوں کی جگہ سوزِ ضیا دیکھ رہا ہوں

شاعر مشرق کا جواب

اے شاعرِ بیدار! تجھے کیسے بتاؤں
اس عالمِ پُر درد کا کیا حال سناؤں
تجھ کو نظر آتے ہیں جو روتے ہوئے چہرے
اِن چہروں پہ تھے خدمتِ اسلام کے سہرے
جن ہونٹوں کو تو وقفِ فغاں دیکھ رہا ہے
ان ہونٹوں نے اِسلام کا پرچار کیا ہے
اُن آنکھوں کو ہر آن جو بیدار رہی ہیں
تسبیح کے دانوں پہ نظر بار رہی ہیں
دوزخ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی روانے
آغوش میں لے لے کے لگایا ہے ٹھکانے

اس جرم میں ملتی ہیں انہیں سخت سزائیں
خونخوار شراروں کی نفس سوز غذائیں

احساس کے ہوتے ہوئے مظلوم رہے ہیں
توحید کی مے پی کے بھی محکوم رہے ہیں

اے نورِ نظر! جب تو مرے ہند میں جائے
اور میری ملاقات کے حالات سنائے

اُس سوئی ہوئی قوم کو ٹھوکر سے جگانا
اور درد بھری لے میں یہ پیغام سنانا

جب تک نہ خس و خارِ غلامی کو جلاؤ
جب تک نہ درِ شرق پہ مغرب کو جھکاؤ

جب تک نہ قفس توڑ کے صیاد پہ لپکو
ہر پھول کو لئے ہر ستم ایجاد پہ لپکو

اُس وقت تلک صاحبِ ایمان نہیں تم
ایمان تو اِک سمت مسلمان نہیں تم
یہ کہہ کے مجھے آپ سوئے خُلد سدھارے
میں تھام کے دِل بیٹھ گیا درد کے مارے

دوشیزہ کا خط قیدی کے نام

سُنا ہے میں نے کہ آزادئ وطن کے لئے
خزاں کی گود میں سوئے ہوئے چمن کے لئے
متاعِ عہدِ جوانی لُٹا رہے ہو تُم
سزا وطن کی محبّت کی پا رہے ہو تُم
شبیں شباب کی زنداں میں کر رہے ہو بسر
جگر میں دوشیزہ کی اُلفت کی آگ بھڑکا کر
تمہاری دید سے گو آنکھ فیضیاب نہیں

تمہارے حسن سے واقف مرا شباب نہیں
مگر خیال کی بستی میں جلوہ بار ہو تم
تصوّرات کی دُنیا سے ہمکنار ہو تم

مرا خیال ہے میں تم سے پیار کرتی ہوں
جبھی تو حُسن و جوانی نثار کرتی ہوں

یہ آرزو ہے مری تم مجھے قبول کرو
ستم نصیب کلی کو ہنسا کے پھول کرو

فرصتِ نغمہ سرائی

مجھے فرصت ملی گر کچھ دنوں نغمہ سرائی کی
تو مظلومی کی گردن کس طرح فرطِ تکبر سے
اکڑ کر خواجگی پر مسکراتی ہے، بتادونگا
تبسم کھیلتا ہے کس طرح مغموم آنکھوں میں
یتیمی کس طرح تانیں اُڑاتی ہے بتادونگا
بڑھاپے کی رگوں میں کسطرح مخمور راتوں کو
جوانی جھوم کر بنسی بجاتی ہے بتادوں گا
غریبی اہلِ دولت کے کراہت خیز چہروں سے
لپک کر کس طرح پردے ہٹاتی ہے بتادونگا
سسکتی نازنینوں کے بسنتی روپ کے آگے

شفق کس طرح گردن کو جھکاتی ہے بتا دونگا
مسرّت کس طرح بیچارگی کے خشک ہونٹوں پہ
تبسّم کی خنک شمعیں جلاتی ہے بتا دوں گا
برسنی انکھڑیوں والے حسینوں کی نظر دِل کو
بہک کر کس طرح بیخود بناتی ہے بتا دونگا
دیارِ ہند کو کس طرح آزادی کا آئینہ
مرے اشعار کی قوت دکھاتی ہے بتا دونگا
مجھے فرصت ملی گر کچھ دنوں نغمہ سرائی کی

نان وایمان

نان کی مضراب سے ہے وجد میں سازِ حیات
نان کی تنویر سے روشن ہے بزمِ کائنات
نان کی قوت سکھاتی ہے جوانی کو غرور
نان سے انسان کو آتا ہے جینے کا شعور
نان دیتی ہے ہوا غیرت کی زریں آگ کو
رن کی جانب موڑتی ہے جرأتوں کی باگ کو
نان دیتی ہے سبق قوم و وطن کی چاہ کا
نان دیتی ہے پتہ انسانیت کی راہ کا
نان کی صہبا سے حاصل ہے جوانوں کو سرور
مسکرا کر آگ کے دریا کو کرتے ہیں عبور

نان سینوں کو عطا کرتی ہے ایسی زندگی
سنناتی گولیوں کو جس سے ہو شرمندگی
نان سے ہوتی ہیں روشن مشعلیں ایثار کی
نان دیتی ہے جوانوں کو خودی تلوار کی!
نان ہی رُخ پھیرتی ہے گردشِ افلاک کا
زندگی کے حادثوں کی جرأتِ بیباک کا
نان اعضا کو عطا کرتی ہے وہ سنگین شباب
ہو چٹانوں کی صلابت جس کے آگے آب آب
نان دیتی ہے جوانوں کو وہ پُر شوکت وقار
جس کے آگے دم بخود ہو جائے فطرت کا شعار
الغرض لازم ہے اتنی نان جینے کے لئے
جس قدر ملّاح لازم اِک سفینے کے لئے

اور امیاں نام ہے اُس قوّتِ موہُوم کا
چھینتی ہے جو متاعِ زِندگی معصُوم کا !
جو بنا دیتی ہے انسانوں کو اس درجہ حقیر
بیچتے ہیں سیم و زر کے چند ٹکڑوں پر ضمیر
جو چھپا کر پیٹ کے بندوں کو اپنی آڑ میں
رات دن رکھتی ہے مزدوروں کے خوں کی تاڑ میں
جو بدل کر راہبر کا رُوپ دیتی ہے فریب
بن کے بجلی پھونکتی ہے خرمنِ صبر و شکیب
جو پہن کر لیڈری کا معصیت آلودہ بھیس
بیچتی ہے مغربی زردار کے ہاتھوں میں دیس
پھانستی ہے جو غریبوں کو خدا کے نام پر
چٹپٹے الفاظ کے دانے بچھا کر دام پر

چھین لے جو نوجوانوں سے جوانی کا خمار
سادہ لوحوں کو بنائے مولویّت کا شکار
گردنوں کو جو جھکائے سیم و زر کے پاؤں میں
خونِ دہقاں سے نہائے ڈاڑھیوں کی چھاؤں میں
ایسے ایماں کو ہمارے دُور سے لاکھوں سلام
ہو رہی ہے جس سے اپنی زندگانی تک حرام

پیشہ ور شاعر سے خطاب

اے الجھنے والے میری زندگی میں جوش[1] سے
پل کے نکلا ہے جو فطرت کے حسین آغوش سے
جس کے نغمے مطلع مغرب سے ٹکرانے کو ہیں
زلزلے اس قصر میں جو پے بہ پے لانے کو ہیں
تیری نظریں ڈھونڈتی ہیں اسکے شعروں میں عیوب
ٹھوکروں سے جس نے چونکائے غلاموں کی قلوب
کھیلتا ہے گود میں جس کی خروش انقلاب
پرورش پاتا ہے آزادی کی دیوی کا شباب
جس پہ وا ہیں آسمان والوں کے سب سربستہ راز
جس کی کلک روح پرور پر جہاں کرتا ہے ناز

[1] شاعر انقلاب

ایسے پیغمبر سے تبرا بہ رو بہ بد شعار!
ہوں ملائک جس کے حلقۂ تلمذ میں شمار

ہوش میں آ تاجر اشعار دولت کے غلام!
تجھ کو بھی آتے ہیں جنت سے مئے گلگوں کے جام!

تو نے دیکھا ہے کبھی نظارۂ باغِ جناں
بھولتی ہے موت تیرے سامنے گستاخیاں؟

تو اگر انصاف کی نظروں سے دیکھے جوش کو
جھک کے بوسہ دے شجاعت کی قسم پاپوش کو

اعلان

میری جانب سے ریاکاروں کو یہ اعلان ہے
اور میری زندگی کا آخری ارمان ہے
چھوڑ دیں میرا وطن چاندی کے ٹکڑوں کے غلام
تلملا اٹھے گا ورنہ میرا عزمِ انتقام
نوجوانوں کی رگوں میں آگ سلگاؤں گا میں
سونے والی غیرتوں کو ہوش میں لاؤں گا میں
مست ہو کر میرے نغموں سے جوانانِ وطن
لے کے شمشیریں بڑھیں گے باندھ کر سر سے کفن
صفحۂ ہستی سے باطل کو مٹا ڈالیں گے یہ
دھجیاں زرّیں قباؤں کی اڑا ڈالیں گے یہ

گنگنائیگا لبِ شاہی پہ آہوں کا ہجوم
جگمگائیں گے حسیں آنکھوں میں اشکوں کی نجوم
دم زدن میں سروری کا گل دیا ہو جائے گا
زلزلہ قصرِ فرنگی میں بپا ہو جائے گا

آستاں ہوگا غلامی کا شہنشاہی کا سر
خلد زاروں کا گماں ہوگا دیارِ ہند پر
دیکھ کر یہ کیف زا منظر بہک جاؤں گا میں
شعر و موسیقی کی آبادی پہ لہراؤں گا میں

بلڈنگ

ہمنشیں وہ سامنے آتی ہے جو بلڈنگ نظر
آئینا ؤں شکل اس کی کیوں ہے یوں جادو اثر

حسن نے بخشا ہے اِس کو زلیست کا رنگین جام
نرم و نازک انگلیوں کے غول سی ہے یہ لالہ فام

اُن سروں پر اسکی اینٹیں ہو کے آئی ہیں سوار
زانوؤں کو جو عطا کرنے کے قابل ہوں خمار

خاکہ وہی کی ہے اُن زلفوں نے اسکی صبح و شام
بدلیاں جھک جائیں جن کو دیکھکر بہرِ سلام

اس کی دیواروں نے اُن باہوں کا لوٹا ہے شباب
چوڑیاں کا جن پہ بجنا چاہیئے زرّیں رباب

اس جگہ وہ ہاتھ مدت تک رہے ہے مصروفِ کار
جامِ مے جن میں مچلنے کے لئے ہو بے قرار
سو رہا ہے اس میں اُن رنگیں جوانوں کا شباب
موت کے رُخ سے اُلٹ سکتے ہیں جو ہنسکر نقاب
مادرِ بیمار کا دل شاد کر سکتے ہیں جو!
سر زمینِ ہند کو آزاد کر سکتے ہیں جو!
آہ لیکن چھوڑتا کب ہے انہیں سرمایہ دار
ہوشیار اے ہمنشیں اس بھیڑیئے سے ہوشیار

جانِ نغمہ

منظورؔ کے نام

آ اے منظورؔ میرے دوست کیا کرتا ہے تو
لوگ آوارہ مجھے کہتے ہیں اور ڈرتا ہے تو!
بادۂ گلگوں سے میں کرتا ہوں تجدیدِ حیات
اور بسر کرتا ہے بے چینی سے تو بستر پہ رات
جھومتا ہوں میں نظر پڑتی ہے جس دم جام پر
تو لہو روتا ہے راتوں کو مرے انجام پر
جب ترے آگے مجھے کہتے ہیں رسوائے شباب
کس لئے لیتا ہے کروٹ تیری آنکھوں میں حجاب
میں جوانی کو جلا دیتا ہوں بہتی آگ سے
کس لئے سینے پہ تیرے لوٹتے ہیں ناگ سے

؎ حضرت منظور بی - لے - ایل ایل - بی لائلپور

جب کسی ساقی کے پہلو میں مجھے پاتا ہے تو
دوست! آخر کس لئے کچھ سہم سا جاتا ہے تو
جب مری گردن میں ہوتے ہیں حسیں بانہوں کے ہار
کیوں نہیں تھمتی تری آنکھوں سے اشکوں کی پھوار
دوست! میرے دل کے کاشانے کے دیرینہ مکیں
سوچتا ہوں کیوں مری راحت تجھے بھاتی نہیں
آہ شاید تو رموزِ زیست سے واقف نہیں
نیند میں کھوئے ہوئے ہیں تیرے جذبات حسیں
اس غلام آباد میں کچھ روز جینے کے لئے
دوست! ہر خود دار ہے مجبور پینے کے لئے
جب کڑکتی ہیں فضا میں بجلیاں آلام کی
دیکھنا پڑتی ہے صورت بادۂ گلفام کی

جب مصائب چوسنے لگتے ہیں انساں کا لہو
دوڑتے ہیں پرسشِ احوال کو جام و سبُو
قیصریت کھیلنے لگتی ہے جب جذبات سے
دُخترِ رز روک دیتی ہے گلابی ہات سے
گھِر کے چھا جاتا ہے جب یادل غم و افکار کا
کام دیتی ہے شرابِ ارغواں غمخوار کا
زندگی سے جب بشر مایوس آتا ہے نظر
چھیڑتی ہے مے شرابی راگ دل کے ساز پر
الغرض اے دوست لازم ہے یہ جینے کے لئے
خُم کے خُم چاروں طرف رکھے ہوں پینے کیلئے

شاعر کا شاہکار

میں اپنے واسطے اِک دلرُبا بناؤں گا

نسیمِ صبح کی شوخی، گلوں کی لے کے مہک
حسیں کلی کا تبسم، کماں کی لے کے لچک
چُرا کے بربطِ ناہید کے حسیں نغمے
دلوں کے ساز پہ گائے ہوئے حزیں نغمے
کسی سے مانگ کے دوشیزگی کی انگڑائی
کسی کی اٹھتی جوانی کی لے کے رعنائی
اثر دعا کا، نگاہوں کا کیف، دل کا گداز
شبِ وصال کی بھولی ہوئی سی اِک آواز
چُرا کے شعر کی نزہت تخیلات کی رَو

کسی کی فکر کی مستی، تصوّرات کی ضَو
عروسِ نو کی امنگیں، شبابِ نو کا غرور
چرا کے ساقیٔ کمسن کی انکھڑیوں کا سُرور
شفق کی مانگ کے سُرخی، کشش ترنّم کی
ملا کے اس میں حسین بجلیاں تبسّم کی
اُڑا کے ساقیٔ میخانۂ ازل کی جھلک
خلوص لے کے شرابی کا، ساغروں کی کھنک
چرا کے نیند کے جھونکے نگار خانے سے
اڑا کے عیش کے لمحے کسی زمانے سے
میں اپنے واسطے اِک دلربا بناؤنگا

اے موت

ابھی تو کیف کی ندی بہائی ہے میں نے
ابھی تو بانسری منہ سے لگائی ہے میں نے

ابھی تو ایک جگر دوز انتظار کے بعد
نقابِ چہرۂ گلگوں اٹھائی ہے میں نے

ابھی تو سازِ جوانی کو میں نے چھیڑا ہے
ابھی تو شوق کی بستی بسائی ہے میں نے

ابھی تو حکم دیا ہے فلک کو سجدے کا
ابھی تو آنکھ زمیں کو دکھائی ہے میں نے

ابھی تو کالی گھٹاؤں کی دیکھ کر مستی
کسی کی زلف کی سوگند کھائی ہے میں نے

ابھی تو حُسن کی ایمن نواز کرنوں سے
جگر میں عشق کی دھونی رمائی ہے میں نے
ابھی تو کھیلنا سیکھا ہوں نرم پھولوں سے
شراب و شعر کی محفل جمائی ہے میں نے
ابھی تو حسن کی مخمور سی شعاعوں پر
جگر کو تھام کے اک چیز گائی ہے میں نے
ابھی تو کاکلِ عنبر فشاں کی لپٹوں سے
تخیلات کی دُنیا سجائی ہے میں نے
ابھی تو شعر کی دنیا کو زندگی دی ہے
ابھی تو جدتوں کی مے لنڈھائی ہے میں نے
ابھی تو میری جوانی نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو دولتِ احساس پائی ہے میں نے!

ابھی تو نیند کے ماتوں کو میں نے چھیڑا ہے
ابھی تو ایک جھلک ہی دکھائی ہے میں نے
خدا کے واسطے اسے موت مجھ کو جینے دے
شراب زیست کے پُر کیف جام پینے دے

خطاب بہ مغنّیہ

یہ ترے نغماتِ شیریں کی فسوں زائیدہ رَو
لہلہاتے زمزموں کی ایک بہتی آبشار
عرش پیمائی کی تانوں سے ہوا میں سلوٹیں
کوہ فرسا دیپکوں کے شعلہ ہائے سحر کار

زمزمے کی ہر لچک ہے موجِ بیتابِ خیال
وہ اُٹھی سازِ جوانی لے کے لہراتی ہوئی
لحن کی انگڑائیاں ہیں رقصِ گردابِ خیال
سرمدی کیفیتوں کے گیت برساتی ہوئی

یہ جوانی اور یہ حُسنِ جہاں آرا ترا
امنڈتی مستیوں کی ایک موجِ سلسبیل
کارواں در کارواں جوشِ ترنّم زا ترا
ہے دلِ صبر آزما کو دعوتِ کوسِ رحیل

کہہ رہا ہے اب یہ مجھ سے میرے دل کا اضطراب
کر رہی ہیں یہ تقاضا اب میری بیتابیاں

جذب ہو کر تیرے نغموں میں رہوں میں کامیاب
غرق ہو کر تیرے نغموں میں رہوں میں کامراں

اے دوست

اب کہاں اے دوست وہ ہنستی ہوئی رنگیں بہار
اب کہاں وہ مہکے مہکے لہکے لہکے خلد زار

اب کہاں وہ دیوداروں کے خنک سایے نصیب
اب کہاں اشکوں کی مالا پر ترا ذکر حبیب

اب کہاں خوابوں میں وہ کھوئی ہوئی سی زندگی
نکہتوں کی گود میں سوئی ہوئی سی زندگی

اب کہاں وہ اودی اودی بدلیاں وہ آبشار

اب کہاں وہ دُور تک چھایا ہُوا رنگِ خمار
اب کہاں معصُوم آنکھوں میں بوقتِ انتظار
گاہ ہلکا سا تبسّم، گاہ ہلکی سی پھوار
اب کہاں سادہ فضائیں اب کہاں معصُوم رُت
آکہ اِک مدت سے اب کٹتی نہیں مغمُوم رُت
آہ آلامِ زمانہ نے جوانی چھین لی
چھین لی اے دوست مجھ سے زندگانی چھین لی

وطن کو خیرباد کہتے ہوئے

سلام اے وطن کی حسیں سیرگاہو — کسی کے قدم چومنے والی راہو
سلام اے وطن کی فسوں گر ہواؤ — شرابوں میں ڈوبی ہوئی سی فضاؤ
سلام اے پریتوں کی رنگین وادی — بہاروں میں کھوئی ہوئی خلد زادی
سلام اے پہاڑوں کی دلکش قطارو — سلام اے مرے رازداں دیودارو
سلام اے تمنا کی آنکھوں کے تارے — سلام اے مری حسرتوں کے سہارے
سلام اے جوانی کی راتونکی زینت — وطن کے جوانوں کی باتوں کی زینت

بہت دور باچشمِ تر جا رہا ہوں
نہیں چاہتا ہوں مگر جا رہا ہوں

مجھے یاد کر کے نہ آنسو بہانا — حسیں انکھڑیوں کو نہ بیکل بنانا
جگر کو نہ ٹیسوں سے آباد کرنا — جوانی کی راتیں نہ برباد کرنا

محبت میں خود کو نہ بیکار کرنا　　لبوں کو نہ آہوں سے دوچار کرنا
اگر زندگی نے رفاقت نہ چھوڑی　　اگر موت نے سانس کی لے نہ توڑی
تو دم تیرے زانو پہ توڑوں گا بلبلا
تجھے بعد مرنے کے چھوڑوں گا بلبلا

اَے حبیب

مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر
جگر کو سوزشِ پیہم سے ہم کنار نہ کر
مرے شباب کی راتوں کو سوگوار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

ترس رہی ہے تری دید کو نظر میری

تمام رات رُلاتی ہے آرزو تیری
مری بہار خدارا خزاں شکار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

ہُوئی ہے عُمر مسرّت کی بھیک پا نہ سکا
ہزار چاہا بھی میں نے تو مُسکرا نہ سکا
خرابِ زیست کو اتنا تو بے قرار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

نظر کو حوصلۂ عرضِ غم دِیا میں نے
برستی آنکھ سے کارِ زباں لیا میں نے
مگر جواب کہ "یہ ذکر بار بار نہ کر"
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

وطن میں جاکے جو غربتِ زدہ کو بھُولنا تھا

نشاط و عیش میں حسرت زدہ کو بھولنا تھا
تو کیوں یہ کہہ نہ دیا پہلے "ہم سے پیار نہ کر"
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

بملا کو پہلی بار کمپنی باغ لائل پور میں دیکھکر

ہو رہا تھا گم شفق زاروں میں مہرِ آبدار
آ رہا تھا شام کی دیوی کے جوبن پر نکھار
مُسکراتے تھے ستارے آسماں پر اس طرح
رات کو ترسی ہوئی آنکھوں میں آنسو جس طرح
نزہتوں پر بانکپن تھا، مست جھونکوں پر شباب
ذرّہ ذرّہ پی رہا تھا دید کی ہلکی شراب

مسکراہٹ تھی لبِ فطرت پہ آنکھوں میں خمار
پھر رہی تھی نیند کی دیوی ہواؤں پر سوار
غنچہ غنچہ باغِ ہستی کا تبسّم ریز تھا
گلشنِ امید کا ہر پھول عنبر بیز تھا
ایسے عالم میں روش پر دفعتاً کچھ بجلیاں
آکے میرے سامنے لینے لگیں انگڑائیاں
اُن میں اک کافر ادا بملا جسے کہتی تھیں وُہ
جس کے پیچھے خادماؤں کی طرح رہتی تھیں وُہ
مسکرائی دیکھ کر میری طرف کچھ اس طرح
آسماں پر برقِ بے آواز کوندے جس طرح
یہ جو دیکھا تو تمنّائیں جواں ہونے لگیں
حُسن کے مخمور جلووں میں مجھے کھونے لگیں

دِل نے دی آواز، الطافِ حزیں! جاتا ہوں میں
اب ترے سینے کو اس قابل نہیں پاتا ہوں میں

تھرتھرائے ہونٹ، آنسو آنکھ سے بہنے لگے
درد کے خنجر جگر کے کان میں کہنے لگے

آج سے کرتے ہیں ہم ایوانِ حسرت میں قیام
سونپتے ہیں سوزشِ پیہم کو تیرا انتظام

قسیمہ کے آنسُو

رحم! اے چشمِ تصوّر!! رحم میرے حال پر

آج وہ منظر دکھا کر پھر مجھے بیکل نہ کر

آہ وہ منظر قسیمہ رو رہی تھی جس گھڑی

تخمِ غم پہلو میں میرے بو رہی تھی جس گھڑی

آہ وہ منظر، جُدا ہونے کا منظر، الاماں

جب قسیمہ کی حسیں آنکھوں سے آنسو تھے رواں

آہ وہ آنسو مری شاموں کے ننھّے ماہتاب

آہ وہ آنسو مری برباد راتوں کے شہاب

آہ وہ آنسو تمنّا جن میں اک معصوم کی

زہرِ مایوسی کا کھا کر کھو رہی تھی اپنا جی

آہ وُہ آنسو مرے دِل میں جو پا کر بیکلی
جھانکنے لگتے تھے آنکھوں کے دریچوں سے کبھی
آہ وہ آنسو جُدا ہوتے ہوئے بہتے تھے جو
اِک دلِ غم آشنا کا ماجرا کہتے تھے جو
آہ وہ آنسو کہ جن میں رقص کرتے تھے شرار
آہ وُہ آنسو کہ جن پر لعل و گوہر ہوں نثار
آہ وہ آنکھوں کے میخانے سے مے کی آبشار
جس کے آگے مُنہ چُھپا لے اپنا ساون کی بہار
آہ وہ آنسو کہ جن پر موتیوں کا تھا گماں
آہ وہ آنسو کہ جن کی یاد ہے دل پر گراں
آہ وہ آنسو کہ جنکی رَو میں دِل بھی بہہ گیا
اور الطافِ حزیں سے جاتے جاتے کہہ گیا

تو ابھی جی راہِ اُلفت میں بھٹکنے کے لئے
اور دِل جیتا رہے تیرا دھڑکنے کے لئے

توبہ

اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے ناصح
چراغِ حسن کی لَو پر مجھے جلا دینا
کسی نگاہ سے کچھ بجلیاں گرا دینا
کسی حسین کے جادو فروش زانو پر
تھپک کے نیند قضا کی مجھے سُلا دینا
گریں جو ساقیٔ مہ وش کے نرم ہونٹوں سے
اُنہیں حسین گلوں میں مجھے دبا دینا

"مرو تم آتشِ رخسارِ سُرخ میں جلکر"

کروں جو بادہ کشی تو یہ بد دُعا دینا

مرے نصیب کی مشعل ہو گر کبھی روشن

تو آبِ خوشۂ انگور سے بجھا دینا

نظر کی، دل کی جبیں کی، جگر کی، ہونٹوں کی

غرض جو جی میں ترے آئے وہ سزا دینا

اگر شراب کو چھوؤں بھی آج سے ناصح

شکریہ کشمیر

کشمیر کی حسین بہاروں کا شکریہ — دل چھین لینے والے نظاروں کا شکریہ
ہوتے ہیں آسمانِ محبت سے جو طلوع — اُن برق در کنار ستاروں کا شکریہ
پھرتا ہے جن پہ حسن جوانی کی مے لیا — اُن سحر بار رنگیں کناروں کا شکریہ
لیتی ہے جنمیں کروٹیں پُرکیف رنگینی — اُن ننھی ننھی مست پھواروں کا شکریہ
جو سُرخ دامنوں سے الجھتے ہیں وقتِ سیر — اُن خوش نصیب پودوں کے خاروں کا شکریہ
بدمست انکھڑیوں سے ٹپکتی ہے جو شراب — اُس کے شباب خیز خماروں کا شکریہ
لے لیکے جنکو اٹھتی ہے محبوبۂ نگاہ — اُن سبز سُرخ پیلے سہاروں کا شکریہ
کرتا ہے کوئی چھپ کے جو پتھر کی آڑ میں — اُن مار دینے والے اشاروں کا شکریہ

الطاف جا رہا ہوں ہیں مجبورِ روزگار
اللہ پھر دکھائے مجھے یہ حسیں دیار

وعدہ

شہر کی شورش سے ہٹ کر، مدھ بھری راوی کے پار
پھر کروں گا چاندنی راتوں میں تیرا انتظار
پھر جنوں انگیز گلیوں میں بصد حرمان و یاس
تھام کر دل کو پھروں گا ہو کے غمگیں اور اداس
پھر بچھا کر تیرے رستے پر نگاہیں وقتِ شام
آنسوؤں کی سیمگوں مالا پہ لونگا تیرا نام
پھر تجھے پُر کیف راگوں میں بسا ڈالوں گا میں
پھر تجھے قابلِ پرستش کے بنا ڈالوں گا میں
پھر مرے شعروں میں بنکر جان در آئیگی تُو
پھر جوانوں کے حسیں خوابوں پہ چھا جائیگی تُو

پھر تری آنکھوں میں کھل جائیگا میخانے کا باب
پھر چھیڑیگا تری رگ رگ میں جوانی کا رباب
پھر ترے ہونٹوں میں ہو گی دھیمے نغموں کی مٹھاس
پھر تری زلفوں سے آئیگی حسیں پھولوں کی باس
پھر ترے مدہوش کُن ہلکے تبسّم کی ضیا
بہرِ پابوسیِ شعاعِ مہر کو دیگی صدا
پھر تجھے مغرور کر دونگا شبوں کو جاگ کر
نوجوانی کے حسیں لمحوں کی خواہش تیاگ کر
اب نہیں جاؤں گا تجھکو چھوڑ کر کچھ غم نہ کر
رحم کر ان مست آنکھوں پر انہیں پُر نم نہ کر

کسی کے وطن جانے کی خبر سُن کر

سُنا ہے میں نے کہ تم جا رہے ہو سوئے وطن
تمہاری دید کی مشتاق ہے بہارِ چمن

وطن کی پاک فضائیں اُداس ہیں تم بن
چمن کی شوخ ہوائیں اُداس ہیں تم بن

تمہارے ہجر میں غنچے چٹکنا بھول گئے
تمہاری دھن میں عنادل چہکنا بھول گئے

تمہارے درد نے مَے سے خمار چھین لیا
وطن کی شام کا دلکش نکھار چھین لیا

شرابِ حسن کی لہروں پہ وہ شباب نہیں
نسیمِ صبح کے جھونکوں میں پیچ و تاب نہیں

غبار اُٹھتا ہے آہوں کا ناگہاں شب کو
جگر کو تھام کے روتا ہے ہر جواں شب کو
یہ سب درست، مگر اے مرے پری تمثال
کسی غریب، غریب الوطن کا بھی ہے خیال
وہ نوجوان جسے بد نصیب کہتے ہیں
وہ جس کے شعر حسینوں کے لب پہ رہتے ہیں
وہ جس کی رات کو پلکیں کبھی جھکیں ہی نہیں
وہ جس کی آنکھ سے بوندیں کبھی رکیں ہی نہیں
وہ جس کے سینے میں کچھ مشعلیں سی روشن ہیں
وہ جس کے پہلو میں کچھ حسرتوں کے مسکن ہیں
وہ جس نے سجدوں سے تم کو خدا بنا ڈالا
تمہیں عروسِ عقیدت کی گود میں پالا

تمہاری مست نگاہی کا سب کو رام کیا
جہانِ حُسن میں اونچا تمہارا نام کیا
تڑپ تڑپ کے جہاں سے سدھار جائیگا
رُخِ حبیب کو گر سامنے نہ پائے گا

اظہارِ عشق

اِس طرح جرأت کرونگا عشق کے اظہار کی
کھیت کو جب جائیگی تو چھاچھ لیکر دھوپ میں
مسکراؤنگا جوانی بن کے تیرے رُوپ میں
بانسری کی لَے میں تُو ہو جائیگی گُم جس گھڑی
میں تری آنکھوں میں بنجاؤنگا ساون کی جھڑی

رات کو چھیڑے گی تو جب رخنے کا جب رنگیں ستار
میں ترے نغموں میں بن جاؤں گا ہلکا سا خمار
صبحدم جب گائے گی چکّی پہ تو میکے کا راگ
میں ترے سینے میں بنجاؤنگا اُمیدوں کی آگ
تو نہائے گی جو چھُپ کر کیکروں کی باڑ میں
بُلبُلے کی آنکھ بنکر میں رہوں گا تاڑ میں
رات کے ہنگام سو جائیگی جب تو کھاٹ پر
خواب میں بنکر کوئی "چھیڑونگا تجھکو گھاٹ پر
جب کبھی تو جائیگی گرمی میں گیہوں کُوٹنے
بجلیاں بن بن کے گالوں سے لگوں گا لُوٹنے
دن ڈھلے جب لیکے چارہ آئیگی تو گاؤں میں
بن کے سبزہ لیٹ جاؤنگا میں تیرے پاؤں میں

دُودھ دوہنے کی صدا پر جب لگیگی جھُومنے
بن کے گیسو سُرخ گالوں کو بڑھوں گا چُومنے
جب برستی رات میں تو گائے گی میٹھے ملار
میں تری آنکھوں میں بن جاؤنگا ساون کی بہار
اس طرح جرأت کرونگا عشق کے اظہار میں

یہ میرے معبُود

پریم کے ساگر میں جیون کا سندر روپ سفینہ
وصل کی شب دُلھن کے رُخ پر خوشبودار پسینہ
چاند کی متواری کرنوں کا ہنس ہنس پڑتا زینہ
آزادی کے مے خانے میں جھوم جھوم کر پینا
یہ میرے معبود سجنیا ۔ یہ میرے معبود

ساون کے پُرکیف سمے کی بھیگی بھیگی شام
نازک، نرم، گلابی ہاتھوں میں صہبا کا جام
دُور وطن سے بھولے بسرے ہمجولی کا نام
طُور کا جس پر دھوکا ہو وہ جگمگ کرتا بام
یہ میرے معبود سجنیا ۔ یہ میرے معبود

فطرت کی دیوی کے لب سے افسوں پاش صدائیں
البیلی، الہڑ، دوشیزہ کی معصوم ادائیں
جوبن رس کی میٹھی بوندوں سے بھرپور گھٹائیں
جن کی ہر کروٹ میں لاکھوں مینخانے تھرّائیں

یہ میرے معبود سجنیا۔ یہ میرے معبود

بچپن کی معصوم محبت کی محبوب کہانی
مینخانے کے دروازے پر بیتی ہوئی جوانی
شیشہ محل میں بسنے والی انگوروں کی رانی
جس کے پسینے سے ہو جائے امرت پانی پانی

یہ میرے معبود سجنیا۔ یہ میرے معبود

شانوں پہ لہرانے والے کالے کالے ناگ
نیند کی پریوں کے ہونٹوں میں پلنے والے راگ

پیمانوں میں بٹنے والی مست گلابی آگ
جس کے ہاتھوں میں جنّت کے دربانوں کی باگ

یہ میرے معبود سبجنیا۔ یہ میرے معبود

شہر کیوں چھوڑ رہے ہو؟

جن دِنوں ہیں لائل پور چھوڑ رہا تھا، مجھے میرے عزیز دوست
چوہدری عطا محمود خانصاحب رئیس اعظم پکّا ماڑی لائلپور نے کہا
"شہر کیوں چھوڑ رہے ہو؟"
اس نظم کے ذریعے اُس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے
(الطاف)

چھوڑتا ہوں شہر ایسی ماہرو کے واسطے
شب کو سوتی ہے جو تاروں کی ردا کو اوڑھ کر
چاند کی کرنوں کی ٹھنڈی سی ضیا کو اوڑھ کر
جو ہوئی ہے نکہتوں کی گود میں پل کر جواں
کھیلتی ہے مدھ بھری موسیقیوں کے درمیاں

مُسکراتی ہے جو پھولوں کی مہک کے ساز پر
گنگناتی ہے جو غنچوں کی چٹک کے ساز پر
جو نشیلے زمزموں کے دوش پر ہو کر سوار
زندگانی کو عطا کرتی ہے چمکیلا نکھار
میکدے لیتے ہیں جس کی آنکھ میں انگڑائیاں
کروٹیں لیتی ہیں رگ رگ میں جواں رعنائیاں
پھول شرماتے ہیں جس کو مسکراتے دیکھ کر
نزہتیں رستے میں بچھ جاتی ہیں، آتے دیکھ کر
جھومتی ہے جو جوانی کے نشے میں ہو کے چُور
نوجواں کہتے ہیں جسکو گاؤں کی جنّت کی حُور
چھوڑتا ہوں شہر ایسی ماہرو کے واسطے

مطربہ

اے حسینہ ، مطربہ وجہِ قرارِ زندگی
تیرے ہر انداز سے پیدا ہے سحرِ زندگی

بن کے دیپک جب جہانِ عشق پر چھاتی ہے تُو
رُوح میں بیتابیوں کی آگ بھڑکاتی ہے تُو

تیرے نغمے جب بکھرتے ہیں ہوا کے دوش پر
بجلیاں بن بنکے گرتے ہیں متاعِ ہوش پر

لیکے انگڑائی کبھی جب سامنے آتی ہے تُو
دِل میں میٹھی راگنی بنکر اُتر جاتی ہے تُو

تجھ سے بڑھکر ہے کہیں تیری فسوں کاری کی شان
چاند کے اوصاف میں جیسے ضیا باری کی شان

رشک کرتا ہوں میں اس نغموں بھری تقدیر پر
ہے خجل زہرا ابھی تجھ سے آسمانِ پیر پر

شیخ چوگانی[1]

شیخ چوگانی سپہرِ حُسن کا وہ آفتاب
شیخ چوگانی وہ سجدہ گاہ دریائے چناب
جس کی پیشانی پہ رقصاں ہے زمانے کا وقار
غازۂ روئے ثریا جس کے تلوؤں کا غبار
زمزموں کا زیر و بم جس کی رگوں میں تیز ہے
زلفِ موسیقی ہواؤں پر ترنم ریز ہے

[1] مصنف کے گاؤں کا نام۔

نیند کی پریاں نقابِ بیخودی ڈالے ہوئے
حسن کی تابانیوں کو قلب میں ڈھالے ہوئے

چاند کی کرنوں میں چھپکر راتکو آتی ہیں واں
اور ملائم خنکیاں بن بنکے چھا جاتی ہیں واں

نور گرتا ہے فضا میں بن کے سیمیں آبشار
راگنی کی آنچ کرتی ہے دِلوں کو بے قرار

بہہ رہا ہے مست دریا نیند میں کھویا ہوُا
اک ردائے نیلگوں کی گود میں سویا ہوُا

بانسری کی لَے وہ چرواہوں کا رازِ زندگی
وجد میں آتا ہے جس کے دم سے سازِ زندگی

گونجتی ہے گانوں کے ٹیلوں سے ٹکراتی ہوُئی
بربطِ ناہید کے نغموں کو شرماتی ہوُئی

حُسن ہے یُوں چادرِ افلاس میں لپٹا ہُوا
چاند جیسے بادلوں کی گود میں سمٹا ہُوا

الغرض الطاف بیخود سا ہُوا جاتا تھا میں
ذرّے ذرّے کو وہاں کے دلربا پاتا تھا میں

ساقی کی نگاہیں اور شراب

اُن ہیبت نوا سی آنکھوں سے جب کیف کے چشمے پھوٹتے ہیں
اور دیکھنے والے بیداری میں نیند کا جوبن لوٹتے ہیں
پلکوں پہ لئے میخانہ جب ساون کی گھٹائیں آتی ہیں
ہر سمت سے ظالم توبہ شکن مخمور صدائیں آتی ہیں

جب رات کی رانی چپکے سے آنکھوں میں نیند انڈیلتی ہے
اور شام سے لیکر صبح تلک اک ٹیس جگر سے کھیلتی ہے

جب صحنِ چمن سے وقتِ سحر آلام کا بادل پھٹتا ہے
غنچوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے تبسّم بٹتا ہے

جب درد کے مرہم سے شاعر زخموں کے دہن کو بھرتا ہے
احساس کی تصویروں کو جب قرطاس کی زینت کرتا ہے

جب درد کی لہریں سینے کے ساحل پر دم بھر اُٹھتی ہیں
اطراف مرے پہلو میں جب کچھ حُسن کی نظریں ڈھونڈتی ہیں

جب لیلئ مغرب کے در پر سُورج کی نگاہیں جُھکتی ہیں
اور درد کے مارے انساں کی کچھ دیر کو آہیں رُکتی ہیں

جب دِل کے ساز کو مِلا کی مدہوش نگاہیں چومتی ہیں
جب تارِ نفس کے پہلو میں نغموں کی گھٹائیں جُھومتی ہیں

اُس وقت ملا کر صہبا میں ساقی کی نگاہیں پیتا ہوں
اور حُسن کی بے خود کرنوں سے زخموں کو کچھ کچھ سیتا ہوں

یاد

شعاعِ مہر جب شبنم کی ہستی کو مٹاتی ہے
نسیمِ صبح جب خوابیدہ کلیوں کو جگاتی ہے
سیاہی جب سمٹ کر پہلوئے فطرت میں سوتی ہے
فضا جب بارشِ انوار سے معمور ہوتی ہے
شرابِ عشق جب ڈھلتی ہے بلبل کے ترانے میں
چمن میں قمریاں ہوتی ہیں جب مشغول گانے میں
کنوئیں پر جب حسیں پنہاریاں پانی کو جاتی ہیں

خوشی سے صبح کی تابانیوں میں مسکراتی ہیں
مجھے اُس وقت کچھ گزرے ہُوئے دن یاد آتے ہیں
کسی کے جلوے رہ رہکر خیالوں میں سماتے ہیں
شہِ خاور کا دورِ زندگی جب ختم ہوتا ہے
عروسِ شام کی رنگینیوں میں جان کھوتا ہے
مسلط ہلکی ہلکی تیرگی عالم پہ ہوتی ہے
فلک پر لیلیٰ شب موتیوں کا بیج بوتی ہے
پپیہے جب بیابانوں میں پی کی رٹ لگاتے ہیں
نکل کر مست چرواہے چراگاہوں سے آتے ہیں
مساجد میں خدا والے خدا کو یاد کرتے ہیں
نشیمن طائرانِ خوشنوا آباد کرتے ہیں
سکوتِ شام کے بربط پہ مستی چوٹ کھاتی ہے

زمانہ اونگھتا ہے نیند کو بھی نیند آتی ہے

مجھے اُس وقت کچھ گزرے ہوئے دن یاد آتے ہیں

کسی کے جلوے رہ رہکر خیالوں میں سماتے ہیں

نکل کر باغ میں جب مہوشوں کے غول آتے ہیں

امنگوں کو جگاتے اور چہل قدمی کو جاتے ہیں

سنیماؤں میں جب حُسن و ادا کی آگ جلتی ہے

شرابِ شعر جب راگوں کے پیمانوں میں ڈھلتی ہے

نوا کے ساتھ جب دِل کی اُمنگیں تلملاتی ہیں

تمنّائیں مچلتی ، آرزوئیں جوش کھاتی ہیں

فسوں چھاتا ہے جب بچینیاں خاموش ہوتی ہیں

نگاہیں بھی شرابِ دید سے مدہوش ہوتی ہیں

ادائے جانفزا جب حسرتوں کو گدگداتی ہے

مرے پہلو سے اک سہمی ہوئی آواز آتی ہے
مجھے اُس وقت کچھ گزرے ہوئے دن یاد آتے ہیں
کسی کے جلوے رہ رہ کر خیالوں میں سماتے ہیں

راوی کا کنارہ

جب رات کی دیوی بستر سے اُٹھ کر انگڑائی لیتی ہے
آکاش کے ساگر میں قدرت جب چاند کی کشتی کھیتی ہے
فطرت جب نیند کی پریوں کے شانوں کو جنبش دیتی ہے
اُس وقت کنارِ راوی پر اک دلکش منظر ہوتا ہے

سُورج کی کرنیں پانی پر جب زرّیں جال بچھاتی ہیں
جب جذبِ شفق سے اُٹھ اُٹھ کر اشنان کو پریاں آتی ہیں

جب لہریں حُسن کی عُریانی سے بیخود سی ہو جاتی ہیں
اُس وقت کنارِ راوی پہ اک دلکش منظر ہوتا ہے

جب نیند میں نازک ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم ہوتا ہے
جب عشق آوارہ جلووں میں سب عقل و دانش کھوتا ہے
جب حسن کا پرتو موجوں کے آغوش میں بیخود سوتا ہے
اُس وقت کنارِ راوی پہ اک دلکش منظر ہوتا ہے

سرما کی ٹھنڈی راتوں میں جب ہُو کا عالم طاری ہو
زہرہ کی چشمِ پُرنم سے اشکوں کی بارش جاری ہو
جب چاند کی سیمیں کرنوں کے بربط سے نغمہ باری ہو
اُس وقت کنارِ راوی پر اک دلکش منظر ہوتا ہے

ساون کے رنگیں موسم میں بدمست گھٹائیں جھومتی ہیں
جب حُسن کی حسرت میں نظریں راوی کے کنارے گھومتی ہیں

اور گورے گورے اعضا کو لہروں میں چھپ کر چومتی ہیں
اُس وقت کنارِ راوی پر اک دلکش منظر ہوتا ہے

جب یاد کسی کی بستر پر الطاف مجھے تڑپاتی ہے
راتوں کو رونے دھونے میں جب نیند مری اُڑ جاتی ہے
جب دور کسی کونے میں دل کے بالا دیپک گاتی ہے
اُس وقت کنارِ راوی پر میں اُٹھ کر جایا کرتا ہوں
اشکوں کی زباں سے لہروں کو کچھ یاد دلایا کرتا ہوں

قسم

قسم اُس ساز کی جو تیز رَو اشکوں کی بارش سے
بھگو کر زمزموں کو زندگی میں بجلیاں بھر دے
قسم تکیئے کی جو راتوں کو اکثر بھیگ جاتا ہے
مجھے اُن کا شبابِ جاں فزا جب یاد آتا ہے
قسم اشکوں کی جو سہمی ہوئی آنکھوں سے بہتے ہیں
مسافر جب خدا حافظ حسیں ہونٹوں سے کہتے ہیں
قسم اُس آہ کی جو رات بھر بیدار رہتی ہے
خصوصاً جن دِلوں آنکھوں سے اِک ندی سی بہتی ہے
قسم دوشیزۂ صحرا کے اُن غمگیں ترانوں کی
کہ خوشبو جن سے آتی ہے محبّت کے فسانوں کی

قسم آواز کی جو دِل کے ویرانے سے آتی ہے
گدا کو دیکھ کر جب قیصریت مسکراتی ہے

قسم آنکھوں کی جن سے خون کے چشمے اُبلتے ہیں
کسی کی یاد کے جب ولولے کروٹ بدلتے ہیں

قسم وقتِ وداعِ دوست غم اندوز بانوں کی
قسم پردیس میں گزری ہوئی پُر سوز راتوں کی

قسم اُس سوز کی ناسُور کو جو گدگداتا ہے
مسافر کے وطن سے موت کا جب تار آتا ہے

قسم اُس خون کی زخمِ دروں سے جو ٹپکتا ہے
مریضِ جاں بلب جب واپسیں نظروں سے تکتا ہے

قسم بھلا کے اُس مدہوش کُن ہلکے تبسّم کی
کہ جس میں دلکشی ہے قدسیوں کے سے ترنّم کی

قسم بملا کی اُن آنکھوں کی جنمیں کیفِ مے رقصاں
قسم بملا کے اُن ہونٹوں کی جن میں رنگِ گل لرزاں
قسم اُس وقت کی جب کھانسنے میں خون آتا ہے
ہر اک چہرے پہ جب بیمار مایوسی سی پاتا ہے
کہ پھر عہدِ گذشتہ کی حسیں راتوں کو لاؤں گا
جمال آرا مناظر کو کلیجے سے لگاؤں گا

امرتسر میں ایک رات

امرتسر ایک رات ثریا جبیں کے ہاں
ہم میزباں تھے حضرتِ اختر تھے میہماں
وہ رات جس میں درد کی ٹیسوں پہ تھا شباب
وہ رات جس میں آہ کے رُخ سے اُٹھا نقاب
وہ رات جس میں حُسن کے آنسو تھے ضَو فگن
وہ رات جس میں عشق کی آہیں تھیں نغمہ زن
وہ رات جب لبوں پہ کراہوں کا تھا قیام
وہ رات جس کے فیض سے نیندیں ہُوئیں حرام
وہ رات جس میں چھن گیا آرامِ زندگی
لبریز جس سے ہونے کو ہے جامِ زندگی

وہ رات جس نے مجھ کو تڑپنا سکھا دیا
وہ رات جس نے دِل کو دھڑکنا سکھا دِیا

وہ رات جب فضا میں اُداسی تھی یاس بار
وہ رات جس میں لُٹ گیا دل کا مِرے قرار

وہ رات جس نے زیست کو مشکل بنا دِیا
وہ رات جس نے موت کا منظر دِکھا دِیا

وہ رات جب سے سینے پہ گلشن کا ہے گماں
غم نے دلِ حزیں میں بنایا ہے آشیاں

وہ رات بیکلی نے لیا دل میں جب جنم
وہ رات جس میں زیست ہوئی واقفِ الم

وہ رات جس کی یاد ہے اِک دردِ لازوال
اللہ پھر وہ رات ہو اور وہ پری جمال

شریکِ زندگی کے نام آخری پیغام

اے شریکِ زندگی اے وقفِ ہر رنج و الم
آج وہ شوہر ترا غربت میں ہے وقفِ ستم
جس کے تلووں کو گلوں کی پتیاں زخمی کریں
ریشمیں بستر کی جس کو سلوٹیں سونے نہ دیں
آج وہ بیکس زمانے کا گِلہ کرتا ہوا
جا رہا ہے سُوئے منزل سسکیاں بھرتا ہوا
کوئی دم میں گل چراغِ زندگی ہونیکو ہے
بیکسی کی گود میں شوہر ترا سونے کو ہے
یہ تو مانا میرے مرجانے سے ہوگی تو نڈھال
خوں رلائے گا تجھے گزری بہاروں کا خیال

حسرتیں ہونگی زبوں حالی پہ تیری سوگوار
زندگی ہوگی اجیرن اور ستائے گی بہار
تجھ کو لیکن اپنے الطاف حزیں کا واسطہ
کیف میں ڈوبی ہوئی چشمِ حسیں کا واسطہ
تجھ کو اُن مخمور راتوں کی قسم دیتا ہوں میں
وصل کی مسرور راتوں کی قسم دیتا ہوں میں
تجھ کو تیری کمسنی میں بیوگی کا واسطہ
بیکسی کا واسطہ، بے چارگی کا واسطہ
حُسن کی معصوم آہوں کی قسم دیتا ہوں میں
عشق کی پُرہول راہوں کی قسم دیتا ہوں میں
بھول جانا مجھ کو بس یہ آخری پیغام ہے
اس حیاتِ چند روزہ کا یہی انجام ہے

یہ کتاب ہستیٔ فانی کی اک تفسیر ہے
خواب جو دیکھا ہے میں نے اُسکی یہ تعبیر ہے

خوابوں کی دنیا

جہاں معصومیت باہم خیالوں میں مچلتی ہے
محبّت پاکبازی کے شبستانوں میں پلتی ہے
ریاکاری فرشتوں کے تبسّم سے بدلتی ہے
ہوا کی کروٹوں پر قدسیوں کا رقص ہوتا ہے
مری تخئیل میں بہکے ہوئے خوابوں کی دُنیا ہے

گلوں کے چمپئی پردوں میں شرمائے سے نغمے ہیں

عروسِ حسن کے ہونٹوں پہ گھبرائے سے نغمے ہیں
شباب و شعر کی دُنیا پہ لہرائے سے نغمے ہیں
جہاں آغوش میں موسیقیوں کی حسن سوتا ہے
مری تخئیل میں بہکے ہُوئے خوابوں کی دُنیا ہے
ستارے شعریّت کی سحر زا موجوں میں رہتے ہیں
شرابِ خود فراموشی کے دریاؤں میں بہتے ہیں
زبانِ خامشی سے عشق کی رو داد کہتے ہیں
جہاں جامِ محبّت بزمِ رنداں میں چھلکتا ہے
مری تخئیل میں بہکے ہوئے خوابوں کی دُنیا ہے
جہاں ساغر کھنک کر شغلِ مے نوشی سکھاتے ہیں
جہاں پردے سرک کر عشق کو بیخود بناتے ہیں
جہاں دیدے بہک کر نیند کے جھونکے لٹاتے ہیں

جہاں اشعار کی رنگینیوں میں حسن پلتا ہے
مری تخئیل میں مہکے ہوئے خوابوں کی دنیا ہے

جہاں آتی ہے بملا گیسوئے شبگوں کو لہرائے
رُخِ روشن سے ہلکے سرمئی گھونگھٹ کو سرکائے
تکلم میں لبِ لعلیں سے دلکش پھول برسائے
جبینِ شوق میں سجدوں کا بادل تلملاتا ہے
مری تخئیل میں مہکے ہوئے خوابوں کی دنیا ہے

بملا کا پریم

مجھے بملا کی روداد محبت یاد ہے اب بھی
مرا کاشانۂ دل درد سے آباد ہے اب بھی
وہ شیشم جس کے نیچے ہم دلوں کے راز کہتے تھے
چھپا کر پونچھ لیتے آنکھ سے آنسو جو بہتے تھے
وہ ٹیلے جنکے دامن میں دلوں کے پھول کھلتے تھے
وہ ٹیلے اور ٹیلے جنکی اوٹ میں کبھی ہم چھپ کے ملتے تھے
وہ بملا اب بھی ہے مجھ سے مری تخئیل کہتی ہے
تصوّر کی سنہری چلمنوں میں چھپ کے رہتی ہے
وہ وادی آہ وہ وادی مری بملا کا کاشانہ
ٹپکتا تھا جبینوں سے جہاں سجدوں کا نذرانہ

وہ وادی جس کے ذرّے ذرّے کو نظروں نے چوما تھا
وہ وادی جس کے حسنِ سحر زا پر عشق جھوما تھا
وہ وادی جسکے سینے پر رواں تھا حُسن کا دریا
وہ وادی جسمیں بپیا کا نہ پھرتی تھی مری بملا
وہ وادی جسمیں لاکھوں وادیاں ایمن سی پنہاں ہیں
وہ وادی جسکے جلووں پر ہزاروں طور قرباں ہیں
وہ وادی جسکو حُسن و عشق کی آماجگہہ کہئے
کسی اُٹھتی جوانی کی سرور آگیں نگہہ کہئے
وہ وادی اب بھی ہے لیکن شرابِ شعر سے خالی
گھٹا تاریکیوں کی چھا گئی اللہ رے پامالی
وہ راتیں آہ جنمیں زانوؤں کے مخملیں تکئے
سرِ الطاف کو فیضِ محبت سے میسّر تھے

وہ راتیں آہ جنمیں حسن نے چالاکیاں سیکھیں
وہ راتیں آہ جن میں عشق نے بیباکیاں سیکھیں
وہ راتیں آہ حسن و عشق کی وہ رازداں راتیں
وہ راتیں آہ کیفِ سرمدی کی پاسباں راتیں
وہ راتیں جبکہ تھا لبریز افسوں کوہساروں میں
وہ راتیں جب ترنّم چھڑ رہا تھا آبشاروں میں
وہ راتیں جب کوئی کرنوں کے بربط کو بجاتا تھا
وہ راتیں جب کوئی دھیمے سُروں میں گیت گاتا تھا
وہ راتیں جب حریم ناز سے پردہ اُٹھایا تھا
کسی کے آستاں پر جب نگاہوں کو بچھایا تھا
وہ راتیں جب فضا پر میکدے سے چھائے رہتے تھے
وہ راتیں جب ہوا میں مستیوں کے رقص بہتے تھے

وہ راتیں نرم باہیں جب گلے میں ہار ہوتی تھیں
وہ راتیں جن کے آغوشِ تمنّا میں وہ سوتی تھیں
وہ راتیں جب محبّت چٹکیاں لیتی تھی باتوں میں
وہ راتیں جب محبّت پرورش پاتی تھی گھاتوں میں
وہ راتیں اب بھی ہیں لیکن مجھے کھانے کو آتی ہیں
خلش بن کر مرے زخمِ دروں کو گدگداتی ہیں

التجا

حریمِ ناز سے چلمن کو اب اُٹھا بھی کہیں
مری نگاہ کو بے باکیاں سکھا بھی کہیں
شرارِ عشق سے سوزِ دروں بڑھا بھی کہیں
جبینِ شوق میں سجدوں کو گدگدا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

میں شب کو درد میں ڈوب جاتا ہُوں بملا
ترے خیال میں آنسو بہاتا ہُوں بملا
جہانِ عشق میں شعلے لٹاتا ہُوں بملا
تو بن کے ابرِ محبّت اُنہیں بجھا بھی کہیں
اس اُجڑے باغ پہ بنکر بہار چھا بھی کہیں

وہ سحر بار ترانے جو یاد آتے ہیں
تو کائنات کے ذرّے بھی گنگناتے ہیں
جگر کے درد کو کچھ اور بھی بڑھاتے ہیں
تھپک کے سوزِ محبّت کو اب سُلا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

مجھے وہ یاد ہے پیپل پہ چل چڑھانا ترا
وہ میرے پاؤں کی آہٹ سے چونک جانا ترا
اُتر کر آنکھ کے رستے سے دِل میں آنا ترا
اُسی ادا سے نگاہوں میں پھر سما بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

ترے بغیر جہاں میں کہیں قرار نہیں
اور اپنی زیست کا بھی کوئی اعتبار نہیں

خزاں کا جس پہ تسلّط ہو وہ بہار نہیں
گذر رہی ہے جوانی بس اب تو آ بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

تُو اب بھی دِل کے پھپھولوں کو گدگداتی ہے
نشے سے چُور ستاروں میں مُسکراتی ہے
مرے خیال میں تصویر بن کے آتی ہے
یہ ایک پردہ سا ہے درمیاں اُٹھا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

قبائے صبر کو اب تار تار کرتا ہُوں
ترے حضور میں سجدے نثار کرتا ہُوں
اب اپنے عشق کو میں کامگار کرتا ہُوں
گذر گئی ہیں جو باتیں اُنہیں بُھلا بھی کہیں

اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

فلک پہ تیرے تجسس میں گھوم آتا ہوں
تجھے سمجھ کے ستاروں کو چوم آتا ہوں
نظر فروز مناظر پہ جھوم آتا ہوں
تو میرے حجلۂ دل میں سمٹ کے آ بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

ترے فراق میں اب جاں سے جا رہا ہوں میں
حیات و موت کا جھگڑا چکا رہا ہوں میں
نقوشِ ہستئ فانی مٹا رہا ہوں میں
تو بن کے عہدِ گذشتہ مجھے بچا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

جو تُو نہیں تو تری یاد کیوں ستاتی ہے

اسے سنبھال یہ سوزِ دروں جگاتی ہے
ستم نصیب محبّت کو خُوں رُلاتی ہے
قدم خمارِ محبّت میں ڈگمگا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

ہَوا کا جھونکا اور پردیسی

سُن ہوا کے نرم رَو جھونکے ذرا دل تھام کر
ہو وطن کی دِل نشیں گلیوں سے گر تیرا گذر
منتظر تجھ کو نظر آئے گا کوئی بام پر
چونک کر دیکھے گا تیری سمت میرے نام پر
اُس سے کہنا اے وطن کے گلستانوں کی بہار

درد سے معمور ہیں الطاف کے لیل ونہار
آگئی ہے اُس کے رخساروں پہ اشکوں سے خراش
ہجر کے مسموم تیروں سے جگر ہے پاش پاش
وہ وطن کی صحبتوں کے واسطے بیتاب ہے
زندگانی اُس کی مثلِ ماہئی بے آب ہے
تھک کے اِک دن سایۂ غربت میں سو جائیگا وُہ
نقشِ ہستی صفحۂ عالم سے دھو جائیگا وُہ
موت سے بدتر ہے اب پردیس کا جینا اُسے
پڑ رہا ہے غم کے ساغر میں لہو پینا اُسے
اُس کو خط لکھو کہ وہ پردیس کو اب چھوڑ کر
دیکھ لے آکر وطن کی صحبتوں کو اِک نظر
آسماں پر شب کو جب شمعیں جلاتا ہے کوئی

اُس کو اِک جانب اشاروں سے بلاتا ہے کوئی
دم بخود چپکے سے اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے وُہ
کشتیٔ بحرِ تصوّر اس طرح کھیتا ہے وہ
دیکھتا کیا ہے بنی ہو جیسے کسی کا شاہکار
بہہ رہے ہیں اشک اور دل ہے رہینِ انتظار
پھر رہی ہو گانوٗں کی گلیوں میں گھبرائی ہوئی
زندگانی کے تصوّر تک سے اُکتائی ہوئی
سامنے پا کر تمہیں آپے میں کب رہتا ہے وُہ
کانپتے ہاتھوں کو رکھ کے دل پہ یُوں کہتا ہے وُہ
اے مرے ہردے کی رانی اے تمنّا کے سُہاگ
تجھ کو خاکستر نہ کر دے عشق کی بے نام آگ
جس پریشاں حال نے تجھ کو بنایا ہے نڈھال

جس خرابِ زلیست کا تجھ کو ستاتا ہے خیال
جس کے غم میں قیرگوں زلفیں گلے کا ہار ہیں
ہجر میں جس کے مہکتے پھول مثلِ خار ہیں
جس نے اک رنگیں جوانی کو بنایا سوگوار
جس نے دے کر دردِ الفت کر دیا اختر شمار
جس نے تیری زندگی کو وقفِ حرماں کر دیا
جس نے اک نا آشنائے غم کو حیراں کر دیا
جس کے ہاتھوں لٹ گئی تیرے گلستاں کی بہار
چھن گیا جس کی بدولت زندگانی کا قرار
اب کوئی دِن میں ترے پہلو میں وہ آجائیگا
راحتوں کے پھول پھر سر پر ترے برسائیگا
اتنا کہکر اے مرے غمخوار جھونکے اُس سے تو

جھک کے پھر دریا سے کہنا اے وطن کی آبرو
تجھ کو اک غربت زدہ بیکس نے بھیجا ہے سلام
اور میں اُس کی زباں سے دے رہا ہوں یہ پیام
کیا میرے ہمجولیوں سے اب کوئی آتا ہے واں
کیا ترے بر لب پہ کوئی بھیرویں گاتا ہے واں
شام جب زرّیں شعاعوں کا بجاتی ہے ستار
کیا کنارے پر ترے کرتا ہے کوئی انتظار
کیا حسیں پریوں کا اب بھی غول آتا ہے کوئی
اور چھپ کر اُن کے کپڑوں کو چُراتا ہے کوئی
کیا کوئی پُرسوز نغمہ سُن کے رُک جاتا ہے تو
گانے والے کے قدم پر اب بھی جُھک جاتا ہے تو
کیا وطن کے ہم نوا میرا کبھی لیتے ہیں نام

اب بھی کیا آکر سناتے ہیں کوئی دِلکش پیام
کیا کوئی غربت زدہ اب بھی کسی کو یاد ہے
کیا کسی کا دِل ہماری یاد سے آباد ہے
صبحدم آتا ہے سازِ زندگی جب ہوش میں
کھیلتا ہے حُسن تیرے سیمگوں آغوش میں
یاد میں عہدِ گذشتہ کی بھی سر دُھنتا ہے تُو
دھڑکنیں سہمے ہُوئے دل کی کبھی سُنتا ہے تُو
کیا یہ سچ ہے میرے غم میں تُو نے ہو کہ بیقرار
کر لیا ہے دوسرا رستہ کوئی اب اختیار
اب مرے دیوانخانے کے تلے بہتا نہیں
دیکھ کہ ویراں اُسے رنج و الم سہتا نہیں
آہ لیکن میں کسی قابل نہیں اب اے چناب

مجھ سے تو میرا مقدر بھی ہے اب گرمِ عتاب

اے مرے محبوب اک دِن دفعتہً آؤں گا میں
اور ترے رنگیں کناروں سے لپٹ جاؤنگا میں

پار کے دریا سے فراغت شرق کو بڑھنا ذرا
سامنے پیپل کا آئیگا شجر اک خوشنما

اُس سے کہنا میری جانب سے کہ اَے ذی احترام
بعد مدّت کے تجھے بھیجا ہے اب میں نے سلام

سچ بتا اب بھی کبھی آتا ہوں تجھکو یاد میں
اب بھی کرتا ہُوں ترے دِل کا سکُوں برباد میں

آہ تیری یاد ہے دِل کی غذا میرے لئے
آہ تیرا ذِکر دردِ دل رہا میرے لئے

کیوں نہ ہو جب کی ہیں راتیں ترے سائے میں بسر

ہے بجا تجھ کو کہوں میں سایۂ رحمت اگر

یاد ہے پہلے پہل عہدِ وفا باندھا تھا جب
عشق کی زنجیر میں اک مہ لقا باندھا تھا جب

یاد ہے جب ٹولیوں میں روز آتے تھے حسیں
اور جل تجھ پر عقیدت سے چڑھاتے تھے حسیں

یاد ہے جب دیکھتے رستہ گذر جاتی تھی رات
رو کے تیری ڈالیاں سینے پہ رکھ لیتی تھیں ہات

یاد ہے جب ٹہنیوں پہ گھومتی پھرتی تھیں وہ
تیکھی نظروں سے کسی کو چومتی پھرتی تھیں وہ

یاد ہے وہ رات بھی جب دیر سے آئی تھیں وہ
منتظر پاکر مجھے کچھ دیر شرمائی تھیں وہ

آہ اے پیپل تجھے وہ یاد ہے زرّین ہار

تارِ اشک و آہ میں ہم نے پرو کر ایک بار
تیری گردن میں جو ڈالا تھا بطورِ یادگار
اے ہرے پیپل بتا محفوظ ہے اب تک وہ ہار؟
اِس قدر نایاب تحفے کو اگر کھوئے گا تُو
یاد رکھ اِس بات کو پھر عُمر بھر روئیگا تُو
ہاں وہ ہم نے نام جو کھودے تھے تیری شاخ پر
تجھ کو لازم ہے حفاظت اُن کی بھی شام و سحر
سار بانوں کے ترانوں کی صدا آتی ہے اب
بانسری کی لے تری شاخوں سے ٹکراتی ہے اب
عید کے دن اب بھی جھولا جھولتے ہیں کیا حسیں
مضطرب ہے جن کے تلوؤں کیلئے میری جبیں
سچ بتا اب بھی کبھی آتی ہے وہ زُھرہ جمال

دُور رہ کر جس سے میری زندگانی ہے وبال
حکمراں ہیں جس کے جلوے طُور کے انوار پر
ہے تسلّط جس کا میرے سحر زا افکار پر
آنکھ جس کی نرگسِ بیمار کو بھی یاد ہے
زُلف جس کی بادلوں کی یاد میں آباد ہے
جس کے رخساروں کی لالہ ہے قسم کھائے ہوئے
جس کے اعضا کی لچک شاخوں کو شرمائے ہوئے
اے مرے مخلص وطن میں جب کبھی آؤں گا میں
تیرے قدموں میں وُہی زہرہ جبیں لاؤں گا میں
ہو کے رخصت اُس سے پھر پنگھٹ پہ بھی جانا ضرور
جُھک کے کہنا اے وطن والوں کی ہمنوائی کے نُور
چومتی ہیں تیری اینٹیں اب بھی وہ رنگیں قدم

دیکھکر جن کو تصوّر میں تڑپ جاتے ہیں ہم
اب بھی آتی ہیں کبھی کافر ادا پنہاریاں
پرورش پاتی تھیں جن کے قہقہوں میں بجلیاں
چلبلاہٹ جن کی اک آزار تھی میرے لئے
ہر نظر جن کی کھٹکتا خار تھی میرے لئے
سہم جاتی تھیں جو مجھکو دیکھ کر آتے ہوئے
دیکھتی تھی اُن سے اک مُڑ مُڑ کے شرماتے ہُوئے
جو نگاہوں سے مجھے کہتی تھی آنے کے لئے
چاہتی تھی جو مدد گاگر اٹھانے کے لئے
جو ہے ایوانِ تصوّر میں مرے اب تک مکیں
جس نے میری فکر میں بھر دی شرابِ احمریں
جس نے ضو بخشی میرے افکار کو وہ مہ لقا

جس نے دی ہے زندگی اشعار کو وہ مدلقا

رشک کرتا ہوں مرے پنگھٹ تری تقدیر پر

کاش مل جائے ترے نزدیک اک چھوٹا سا گھر

اے ہوا کے نرم جھونکے دے کے یہ پیغام تو

پھر اسی وادی میں آکر خود کو کرنا سُرخرو

آرزو دے گی دُعا جب لوٹ کر آئے گا تو

اور تمنّا سے بھی آخر کچھ نہ کچھ پائے گا تو

دوشیزۂ صحرا کے نغموں سے متاثر ہو کر

گا رہی ہے اک جمیلہ دلنشیں میٹھے ملار
جس کو کہیے برملا قدرت کا رنگیں شاہکار

کاکلِ شبرنگ کو شانوں پہ بکھرائے ہوئے
آسمانوں پر ہوں بادل جیسے گھبرائے ہوئے

مانی و بہزاد کی رُوحوں کو تڑپاتی ہوئی !
دِلنشیں ہونٹوں سے دِلکش پھُول برساتی ہوئی

ہے رواں اک حسنِ موسیقی کا میٹھا آبشار
وجد میں آیا ہوا ہے بربطِ زرّیں کا تار

اُڑ رہا ہے ایک مینخانہ ہوا کے دوش پہ
ہو رہی ہے بیخودی طاری فرازِ ہوش پہ

مستیاں برسا رہا ہے لحنِ داؤدی کا رنگ
جیسے ندّی کے کنارے بج رہا ہو جلترنگ
یا لبِ جُو کا ترنّم، لالہ رویوں کی پھبن
حُسن کی اُٹھتی جوانی، مست شاعر کا سخن
دِلنشیں تانوں سے یُوں معمور ہے ٹھنڈی ہوا
جیسے کچی نیند میں ہلکی سی بارش کی صدا

تاثّرات

۱- مغموم صداؤں میں، معصوم ہواؤں میں
خاموش فضاؤں میں

اک کیف سا پاتا ہوں

۲- بہکی ہوئی باتوں میں، احباب کی گھاتوں میں
بھیگی ہوئی راتوں میں

اپنے کو مٹاتا ہوں

۳- پُرکیف نزاروں میں، مخمور فسانوں میں
مستی بھری تانوں میں

جی بن کے سماتا ہوں

۴۔ساون کی بہاروں میں، رنگین نظاروں میں
بکھرے ہوئے تاروں میں
دِل تھام کے گاتا ہُوں

۵۔جب یاد وہ آتے ہیں، اور دِل میں سماتے ہیں
اک آگ لگاتے ہیں
اشکوں سے بجھاتا ہُوں

۶۔جاموں کے کھنکنے سے، غنچوں کے چٹکنے سے
پھُولوں کے مہکنے سے
کچھ بھُولتا جاتا ہُوں

۷۔پھر دیکھا ہے متوالے، آنکھیں ہیں کہ میخانے
چھلکے ہوئے پیمانے
پیتا ہُوں پلاتا ہُوں

نوجوان بیوہ شوہر کی میّت پر

مرے حسین مسافر! تو بے قرار نہ ہو
غموں کی آتشِ سوزاں سے ہمکنار نہ ہو
خیالِ دُوریٔ منزل سے اشکبار نہ ہو
میں بن کے ماہ تیری راہ جگمگاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

دیارِ حُسن و محبّت کا تاجدار ہے تُو
فرازِ کوہِ جوانی کا آبشار ہے تُو
مرے شباب کی نکھری ہوئی بہار ہے تُو
میں خود کو پا کے تیرے پاس جھُوم جاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

چلیں گے لُو کے تھپیڑے جو سنسناتے ہُوئے
خزاں کے بربطِ سوزاں پہ گیت گاتے ہُوئے
بہارِ باغِ جہاں کو لہُو رُلاتے ہُوئے
تو بن کے کالی گھٹائیں فلک پہ چھاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

وطن سے دُور نیا اِک وطن بنائینگے
فضا کو قہقہوں کی ضَو سے جگمگائینگے
شرابِ وصل کی لہروں میں کھو سے جائینگے
شباب بن کے بہاروں میں مسکراؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

ترے بغیر جوانی کو کیا کروں گی مَیں
یہی کہ رات دِن آہیں بھرا کروں گی مَیں

سہیلیوں سے فسانے سُنا کرونگی میں
ترستی آنکھ سے دِل کا لہُو بہاؤں گی
مرے حسین مُسافر! میں ساتھ آؤں گی

مرے شباب کے مالک جفا نہیں زیبا
میں صرف تیری ہوں مجھ سے دغا نہیں زیبا
غموں کی آگ کو دینی ہوا نہیں زیبا
تڑپ تڑپ کے وگرنہ تجھے ستاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

یہی تو دِن ہیں جوانی کے، مُسکرانے کے
گُلوں سے کھیلنے، ہنسنے کے، گنگنانے کے
مرے شباب پہ بن کر بہار چھانے کے
میں ان دِنوں میں اکیلی کہاں سماؤں گی

مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

یہ سبزہ زار، یہ سوئی ہوئی فضا کا نکھار
یہ مست مست نظارے یہ ہلکا ہلکا خمار
یہ مے فروش نزانے یہ بہکی بہکی بہار
تجھے جو پوچھیں گے تو کیا انہیں بتاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

ابھی نہ دیکھنے پائی تھی سیر ہو کے تجھے
یہ کیسے مانوں کہ میں جی سکونگی کھو کے تجھے
رہیں گی دید کے قابل یہ آنکھیں رو کے تجھے
بہارِ زیست میں جی بھر کے مسکراؤنگی؟
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

نہ جانے کیوں تجھے پردیس کی لگی ہے لگن

کوئی بھی چھوڑتا ہے ایسی کم سنی میں وطن
پھر ایسے وقت کہ جب نئی نویلی دُلہن
کہاں تک آتشِ فرقت میں دل جلاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

شیوں کو مل کے جو چروا ہے گیت گائینگے
خوشی سے جھوم کے بنسی کو جب بجائینگے
شبابِ نو کی اُمنگوں کو گدگدائینگے
نوا ایسے وقت میں تجھکو کہاں سے لاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

"تمام عُمر" کہا تھا "رہوں گا ساتھ ترے"
"حوادثات کی رَو میں بہونگا ساتھ ترے"
"جو دُکھ پڑینگے جہاں میں سہونگا ساتھ ترے"

مگر وہ وعدے کسے یاد اب دلاؤنگی
مرے حسین مسافر! میں ساتھ آؤں گی

پنہاری

کون آئے مجھکو ایسے میں لپک کر تھامنے
آ رہی ہے ایک البیلی حمیلہ سامنے
گوری بانہوں سے گھڑے کو اِس طرح تھامے ہوئے
آرزوئیں دل میں کوئی جس طرح تھامے ہوئے
بوجھ سے نازک کمر کھائی ہوئی بل اِس طرح
زور دینے سے لچک آئے کماں میں جس طرح
رُخ سے اِک مدہوش کُن رنگِ تمنّا آشکار

جیسے غنچوں کے لبوں پر مُسکراہٹ کی بہار
کِھلکھلاتی سی جوانی، مُسکراتا سا جمال
خواب میں جیسے کسی رنگیں زمانے کا خیال
سُرخ رخساروں سے کُچھ کرنیں سی بکھراتی ہُوئی
جیسے اُٹھے چشمِ آہو کیف برساتی ہُوئی
نرم ہاتھوں کو حنا کے خون میں دھوئے ہُوئے
مہر کے جلوے شفق کی گود میں سوئے ہُوئے
ریشمیں زُلفیں حسیں گالوں پہ بل کھاتی ہُوئیں
جیسے کالی بدلیاں سُورج پہ لہراتی ہوئیں
ہر نفس نزہت بدامن، ہر نفس بندہ نواز
جس طرح محمود کی نظروں میں تصویرِ ایاز
آہ یہ رنگیں جوانی اُف مجسّم دلبری

کر رہی ہے جسم میں پیدا مرے اک تھرتھری

اُن کی آمد

وہ آج آئیں گے میرے غریب خانے پر
بجائے شمع جلاؤں گا آنسوؤں کے چراغ
شرابِ ناب کے بدلے جگر کے خوں کے ایاغ
روش روش پہ بکھیروں کا خونِ زخمِ دروں
بجائے فرش بچھاؤں گا سجدہ ہائے جنوں
دلوں کا رقص اور آہوں کی دُکھ بھری باتیں
برائے شغلِ شکارِ اہلِ عشق کی جانیں
سلگتے نالوں سے دیوار و در سجاؤں گا

مچلتی ٹیسوں کے بربط پہ گنگناؤں گا
بجائے پھولوں کے زخموں کے ہار گوندھوں گا
بطورِ نذر ستم کش جوانیاں دوں گا
کہ آج آئیں گے میرے غریب خانے پر

ناکام خدائی

یہ مانا میں نے کہ تیرا کوئی جواب نہیں
نگار خانۂ ہستی بھی کچھ خراب نہیں
گلوں کے پاک تبسّم میں مستیاں بھی ہیں
فضا میں نرم ترنّم کی بستیاں بھی ہیں
شباب و شعر میں رکھی ہے زندگی کی اساس

مزا زباں کا بدلنے کو ہے لبوں کی مٹھاس
چمن میں مست عنادل بھی ہیں چہکنے کو
نوا میں جامِ جوانی بھی ہیں بہکنے کو
روش روش پہ بہاروں کی ہے فراوانی
کلی کلی میں خماروں کی ہے فراوانی
قدم قدم پہ نگاہوں کی پیاس بجھتی ہے
حسین جلووں سے راہوں کی پیاس بجھتی ہے
ترے جہاں میں محبت بھی ہے شباب بھی ہے
شعاعِ ماہ کا گاتا ہوا رباب بھی ہے
مگر خدائی تری کامیاب بن نہ سکی
کہ ایک بُوند بھی تجھ سے شراب بن نہ سکی

اُداسی

ہر سمت ایک غم ہے اُداسی ہے درد ہے
ہر آرزو کے چہرے پہ حسرت کی گرد ہے
ہر دوست مجھ کو دیکھ کے روتا ہے کس لئے
اشکوں کے ہار آہ پروتا ہے کس لئے
افسردگی سی چار سُو چھائی ہُوئی ہے کیوں
سازِ طرب کو نیند سی آئی ہُوئی ہے کیوں
بملا غریب خانے میں آئی ہُوئی ہیں آج
پھُولوں سے رُخ پہ زردیاں چھائی ہُوئی ہیں آج
وہ دستِ ناز جن کو تھی چھُونے کی آرزو
اُٹھتے ہیں التجا کے لئے میرے رو برو

آنکھیں وہ جن کی دید کی حسرت رہی مدام
لیتی ہیں آنسوؤں کے تقاطر پہ میرا نام

تھے گیسوؤں کے ناگ جو ڈسنے کے واسطے
بادل بنے ہوئے ہیں برسنے کے واسطے

وہ ہونٹ جن سے وعدۂ فردا کی تھی امید
دیتے ہیں آج وصل کی الطاف کو نوید

لیکن نہیں ہے اس پہ بھی دل کو مرے قرار
اللہ کس لئے یہ دھڑکتا ہے بار بار

کہاں جاؤں

کوئی جہاں میں میرا آہ غمگسار نہیں
کسی کی آنکھ مرے غم میں اشکبار نہیں
کوئی نہیں جو مجھے اپنا کہہ کے پیار کرے
مجھے بھی کیفِ مسرّت کا رازدار کرے
کسی کا دل مری اُلفت میں بیقرار نہیں
کسی کو بھی مرا افلاس ناگوار نہیں
کوئی نہیں، جو میری بیکسی پہ رحم کرے
مرے شباب کی بربادیوں پہ آہ بھرے
کوئی بھی دیکھ کے حالت مری نڈھال نہیں
ستم نصیب جوانی کا کچھ خیال نہیں

جہاں میں ایک بھی ایسا نہیں جو فرمائے
کہیں سے ڈھونڈ کر الطاف کو کوئی لائے
اُسے بھی مدھ بھرے لمحات سے دو چار کریں
اُسے بھی کیفِ جوانی سے ہمکنار کریں
اُسے بھی فرطِ مسرّت سے جھومنا آ جائے
نظر سے چاند ستاروں کا چومنا آ جائے
اُسے بھی مہکدے آئیں نظر نگاہوں میں
اُسے بھی ڈھونڈنے نکلیں "حسین" راہوں میں
اُسے بھی بانسری کی لَے سے دے کوئی آواز
اُسے بھی ہونے لگے اپنی زندگی پر ناز
کوئی بتاؤ خدارا مجھے کہاں جاؤں
کہ جس جگہ غم و آلام سے اماں پاؤں

ایک افسانہ نویس خاتون کے شوہر کو دیکھ کر

آہ فطرت کے تبسّم کی ضیائے کیف بار
اور ہو دہقانیت کی ظلمتوں سے ہمکنار
آہ اِک خوش گِل ادیبہ غرقِ صہبائے شباب
ہو جہالت کی دہکتی آگ میں وقفِ عذاب
آہ اک نازک کلی ناواقفِ جورِ خزاں
آتشیں جھونکے کی زد میں آگئی یوں ناگہاں
حیف وہ تخئیل کے معصوم ایواں کی مکیں
غمکدے میں یُوں ہو با حالِ اسیری جاگزیں
جس کی کلکِ گُلفشاں ہو رازدارِ کائنات
ہو مسلّط اُس پہ یُوں آلام کی خونخوار رات

جس کے جذباتِ حسیں ہوں آشنائے رنگ و بو
اُس کی آنکھوں سے تبسم کے عوض ٹپکے لہو
صفحۂ قرطاس پر جس نے بکھیرے گلستاں
حیف وہ شیریں جوانی ہو غموں کے درمیاں
جس کو قدرت نے کیا تخلیق ہنسنے کے لئے
باپ نے سونپا ہے اُس کو ناگ ڈسنے کے لئے
ناگ بھی وہ ناگ جس کی دید پیغامِ قضا
ہر نفس کے ہاتھ میں چھلکا ہوا جامِ قضا
جس کی آنکھوں میں کڑکتی برق منہ کھولے ہوئے
جس کے ہونٹوں میں چھپا تک موت پر تولے ہوئے
جس کے چہرے پر گماں ہوتا ہے کالی رات کا
نام سے جس کے دہل جاتا ہے دل برسات کا

پتھروں کا جسم، لوہے کی رگیں، بادل کا رنگ
ایک نازک آبگینہ حیف یُوں ہو نذرِ سنگ

عبداللہ[1] شاہ کے نام

خوشی سے میرے لئے وجہِ اضطراب بنو
جبینِ زیست پہ آلام کی نقاب بنو
مرے شباب کو غم کی جوانیاں بخشو
زباں کو بیتے دِنوں کی کہانیاں بخشو
حریمِ ناز کے وا جس پہ سارے باب کرو
مری نگاہ کو جتنا بھی ہو خراب کرو
مرے خلاف عداوت کی آگ بھڑکاؤ

[1] قریشی عبداللہ شاہ وکیل سرگودھا۔

مجھے حقیر، کمینہ، ذلیل ٹھہراؤ
مرے لہو سے نہاؤ مجھے تباہ کرو
مرے لبوں کی خموشی کو وقفِ آہ کرو
تمہاری راہ میں آنکھوں کو میں بچھاؤں گا
تمہارے دل کی صداقت کے گیت گاؤں گا
مگر جو دوست کا بہروپ بھر کے آؤ گے
تو مجھ کو زیست کے آغوش میں نہ پاؤ گے
خیالِ دوست سے بھی اب تو ڈر گیا ہوں میں
کوئی بھی سامنے آئے تو کانپتا ہوں میں
کہ یہ بھی عہدِ محبّت کی یادگار نہ ہو
اسے بھی عشق کے درجے کا مجھ سے پیار نہو

میری ہستی

مری ہستی عجب ہستی ہے اس خونخوار بستی میں
کسی مظلوم کے چہرے کو جب مغموم پاتا ہوں
تو مثلِ ماہیٔ بے آب پھر وں تلملاتا ہوں
یتیموں کی صدا جب آہ کے بربط پہ گاتی ہے
تو سینے سے کوئی شے دوڑ کر ہونٹوں کو آتی ہے
حنائی انگلیوں میں دیکھ کر کاسہ گدائی کا
اُتر جاتا ہے چہرہ غم سے میری کبریائی کا
حسیں آنکھوں میں جب اشکوں کی شمعیں جگمگاتی ہیں
تو دل کو درد کی بپتا بیاں آنکھیں دکھاتی ہیں
مُسافر کی نظر میں پڑھ کے غم اندوز افسانے

مرے ماحول کی رنگینیاں لگتی ہیں شرمانے
دمکتے عارضوں کو گرد آلودہ جو پاتا ہوں
تو دل کو تھام کر راہوں میں اکثر بیٹھ جاتا ہوں
جوانی سے بڑھاپا کھانس کر پنجہ ملاتا ہے
تو میری آنکھ میں ساون کا بادل گنگناتا ہے
مری ہستی عجب ہستی ہے اس خونخوار بستی میں

پیتیا جا

رموزِ زیست سے پردہ اُٹھا کے پیتیا جا
شراب و شعر کی وسعت پہ چھا کے پیتیا جا
غرورِ زہد کو نیچا دِکھا کے پیتیا جا
متاعِ عہدِ جوانی لُٹا کے پیتیا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتیا جا

تجھے نگاہ کے چھلکے ہوئے سُبو کی قسم
شراب خانے کی چوکھٹ کی آبرُو کی قسم
عروقِ خوشۂ انگُور کے لہُو کی قسم
جحیم و خلد کا خدشہ مٹا کے پیتیا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتیا جا

وفورِ عیش و مسرّت سے لڑکھڑاتے ہُوئے
تفکّراتِ زمانہ پہ مُسکراتے ہُوئے
قیودِ مذہب و ملّت کا دل دُکھاتے ہُوئے
قدم قدم پہ بہاریں لُٹا کے پیتیا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتیا جا

ملا کے ساغرِ مے میں گنہ کی شیرینی
عروسِ عظمتِ شیطاں کے رُخ کی رنگینی
غرور، سرکشی، الحاد، کفر، بیدینی
جنابِ شیخ کو ساقی بنا کے پیتیا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتیا جا

کوئی کہے اگر آوارۂ شباب تجھے
بتائے رُوئے حقیقت کی گر نقاب تجھے

دکھائے آنکھ سے بھی قبر کا عذاب تجھے
جواب میں تُو فقط مسکرا کے پیتیا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتیا جا

وہ گنگناتی ہوئی آگ جس کے قدموں پہ
شباب سر کو جُھکائے ہوئے ہے شام و سحر
جلو میں ہمتِ عالی کی بجلیاں لے کر
تُو ایسی آگ کو امرت بنا کے پیتیا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتیا جا

ترا شباب جو آلودۂ شراب نہیں
نظر میں کیف نہیں، ہات میں رباب نہیں
فضا میں زلف کا چھایا ہُوا سحاب نہیں
تو تیری زیست پہ اک مُردنی سی طاری ہے

ترے شباب کی آنکھوں سے خون جاری ہے

موسمِ سرما اور غریب الوطنی

تصوّرات کی بستی میں گھومنے والی
حسین نغموں کے ہونٹوں میں جھومنے والی
دِلوں کو شوخ نگاہوں سے چُومنے والی
نہیں ہے پاس تو یُوں وقفِ اضطراب نہ کر
بہارِ موسمِ سرما مجھے خراب نہ کر

کہیں ملے تو یہ کہنا کہ بیقرار ہوں میں
خیالِ عہدِ گذشتہ سے اشکبار ہوں میں
خزاں کی گود میں سوئی ہوئی بہار ہوں میں

سِتم نصیب پہ جینا تو اب عذاب نہ کر
بہارِ موسمِ سرما مجھے خراب نہ کر

نہ پُوچھ باعثِ بیتابی و ملال نہ پُوچھ
ہے مجھ پہ زیست میری کس لئے وبال نہ پُوچھ
شبِ فراق کی تنہائیوں کا حال نہ پُوچھ
دلِ حزیں کے پھپھولوں کو بے نقاب نہ کر
بہارِ موسمِ سرما مجھے خراب نہ کر

کسی کی یاد کی سینے میں آگ بھڑکا کر
ہمارے عہدِ محبّت کے گیت گا گا کر
رگوں میں درد کی بیتابیوں کو دَوڑا کر
مرے شباب کو گُم کردہ شباب نہ کر
بہارِ موسمِ سرما مجھے خراب نہ کر

تجھے شراب میں ڈوبی ہوئی نظر کی قسم
لبِ حسین پہ ہنستی ہوئی سحر کی قسم
کسی کے آنے کی مستی بھری خبر کی قسم
مرے نصیب کی دیوی کو محوِ خواب نہ کر
بہارِ موسمِ سرما مجھے خراب نہ کر

گذشتہ سال تھیں کس درجہ دلنشیں راتیں
وہ سحر بار ترنّم وہ عنبریں باتیں
وہ کیفِ شعر میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں
وہی ہوں اب بھی میں اس درجہ اجتناب نہ کر
بہارِ موسمِ سرما مجھے خراب نہ کر

انتظار

حجرۂ گردوں سے نکلا ماہتاب　　حجلۂ مغرب میں سویا آفتاب
شام کی دیوی نے الٹی ہے نقاب
وہ نہیں آئے مگر

چھا گئی ہیں رات کی تاریکیاں　　نیند میں مدہوش ہے سارا جہاں
دایۂ شب دے رہی ہے تھپکیاں
وہ نہیں آئے مگر

بن سنور کر صبحِ کاذب آگئی　　آ لیو وہ مرغِ سحر کی بانگ بھی
بجلیاں سی روح میں دوڑا گئی
وہ نہیں آئے مگر

لذتِ ہر گوش ہے سازِ حیات　　ہوش میں آیا جہانِ حسیات

چادرِ سیمیں میں لپٹی کائنات
وہ نہیں آئے مگر

جھوم کر کالی گھٹائیں آگئیں
ننھّی ننھّی بوندیاں برسا گئیں
کامنیں کچھ کہہ گئیں ترپا گئیں
وہ نہیں آئے مگر

محوِ ناؤ نوش ہے بزمِ چمن
وجد میں اشجار بُلبل نغمہ زن
نکہتیں پھیلا رہی ہے یاسمن
کاش ایسے میں وہ جانِ آرزو
ایک لمحہ کے لئے ہو رُو برُو

فضلاںؔ کی تصویر

تصویر ہے فضلاںؔ کی یا حُسن کا گلشن ہے
جو ہجر کی راتوں میں تسکین کا مخزن ہے
تخئیل کی بے تابی اور شعر کا ساماں ہے
اے شوقِ جبیں سائی! سنگِ درِ جاناں ہے
ہر ایک ادا میں ہے طوفانِ فسوں کاری
ناہید کے نغماتِ پُر کیف کی مے باری
دُنیائے ترنّم کی مے ریز نوا کوئی
یا چاند کی کرنوں سے خاموش صدا کوئی
عارض پہ سیہ گیسو لہرائے ہوئے سے ہیں
یا ناگ سرِ انجم بل کھائے ہوئے سے ہیں

ـہ گاؤں کی ایک معصوم دوشیزہ۔

مدہوش نگاہوں میں آباد ہیں میخانے
صہبائے جوانی سے لبریز ہیں پیمانے
ہونٹوں سے تبسّم کی مبہم سی جھلک پیدا
اعضا میں نزاکت سے ہلکی سی لچک پیدا
اس کاغذی پیکر سے آواز سی آتی ہے
فضلاں کی محبّت کا سندیس سُناتی ہے
تصویر کے پردے میں ہے راز چھُپا کوئی
یا آنکھ کی پُتلی میں مہتاب نُما کوئی

ایکٹرس سے خطاب

اے حسینہ اے جمیلہ معصیت زادی ہے تُو
تیرے عارض میں جھلکتا ہے غریبوں کا لہُو
تیری ہر جنبش سے پیدا سامری انداز ہیں
خرمنِ اخلاق پر جو برقِ بے آواز ہیں
تیری فطرت پر ریا چھائی ہوئی ہے اِس طرح
بھیگے ساون میں گھٹاؤں کے مناظر جس طرح
دعوتِ شہوانیت ہے نیم عُریانی تری
جگمگاتی ہے گناہوں کو درخشانی تری
رات کو پہلو کی زینت دن کو آنکھوں کا سرُور
یہ تری پُر معصیت ہستی پھر اس پر یہ غرور

ہوش میں آ ہوش میں مومن قبا عصمت فروش
بجلیاں گرنے کو ہیں شعلہ بکف محشر بدوش

تیری آنکھوں سے ٹپکتی ہے سیہ کاری تری
یہ حیا سوزی، دغا بازی یہ عیّاری تری

تیرے نغمے قوم کو مدہوش کرنے کے لئے
اور ترا میٹھا تبسّم، زہر مرنے کے لئے

کاش تجھ کو مادرِ ہندوستاں کا پاس ہو
اور تری فطرت بدل ڈالے جو، وہ احساس ہو

یادِ ماضی

زمانہ کمسنی کا اُف تصوّر میں جب آتا ہے
تو دل میں اک سُرور و کیف کی بستی بساتا ہے
وُہ ماں کی ہلکی ہلکی تھپکیاں اب تک نہیں بھولیں
وہ اُلفت سے لبالب جھڑکیاں اب تک نہیں بھُولیں
وہ جوہڑ کے کنارے جب گھروندے ہم بناتے تھے
وہ جب آبادیوں سے دُور اک بستی بساتے تھے
لڑکپن کا زمانہ کیا بتائیں ہم نشیں کیا تھا
کتابِ زندگی کا ایک زرّیں باب تھا گویا
وہ ابّا کی محبّت والہانہ یاد ہے مُجھکو
وہ ماں کی مامتا کا بھی زمانہ یاد ہے مُجھکو

کبھی جب بادلوں میں ناگہاں بجلی کڑکتی تھی
تو ننھّی جان میری گود میں ماں کی دھڑکتی تھی
لگا لیتی تھیں سینے سے مجھے کس جوشِ اُلفت سے
سُلا لیتی تھیں پہلو میں مجھے اپنے محبّت سے
غرض لبریز بھولے پن سے میری زندگانی تھی
مثالِ نکہتِ گُل گُلستاں پر حکمرانی تھی
وہ البیلا لڑکپن کاش پھر بھی ایک بار آئے
خزاں دیدہ چمن میں پھر نئے سر سے بہار آئے

تیرا شباب

جس طرح غُنچۂ تبسّم کے حسیں آغوش میں
جس طرح بربطِ ترنّم کے حسیں آغوش میں
جس طرح رنگینیوں کی گود میں برقِ جمال
جس طرح ڈوبے ہوئے اشکوں میں پردیسی کے گال
جس طرح کالی گھٹاؤں میں ضیائے آفتاب
جس طرح بدمستیوں کی تہ میں ہلکا سا حجاب
اِس طرح غرقِ بہاراں ہے ترا کافر شباب

پردیسی کی عید

خوں روئے ہمارے آبلے خاکِ بیاباں پر
شفق کے رنگ میں سُرخی عیاں زخمِ جگر کی ہے
وطن والو مبارک ہوں تمہیں گھڑیاں مسرّت کی
ہماری بیکسی پر بھی کبھی تم نے نظر کی ہے
چمن آرائے کُن ہی جانتا ہے اس حقیقت کو
توقّع کب تلک نخلِ تمنّا سے ثمر کی ہے
وطن میں عید کی خوشیاں گلے ملنے سے ہوتی ہیں
یہاں اک صورتِ حسرت نما دیوار و در کی ہے
رہے زندہ تو مِل لینگے وطن کے ہمنواؤں سے
ابھی شامِ جدائی میں جھلک نُورِ سحر کی ہے

اگر میں خدا ہوتا

مری دُنیا حسیں خوابوں کی صُورت کیف زا ہوتی
مری مخلُوق نغماتِ سکُوں کی گود میں سوتی
تبسّم کھیلتے ہر سُو نگاہوں کی جوانی کے
ترنّم آفریں لمحات ہوتے زندگانی کے
فلک پر مستیوں کے جانفزا بادل مچل جاتے
وفورِ شوق سے ساغر بکف انجم اُتر آتے
فضا کے دوش پر بابِ محبّت کھُل کے رہ جاتا
ہر اک ذرّہ شرابِ حُسن کی ندّی میں بہہ جاتا
زمیں سے پھُوٹتے چشمے شرابِ ارغوانی کے
قدم لیتی بہارِ خُلد ہر رنگیں جوانی کے

گلوں کی پتیوں کے پیرہن زیبِ بدن ہوتے
مری مخلوق میں اہلِ چمن سے بانکپن ہوتے
مری دُنیا میں حُسن و عشق کی ہوتی قلمرانی
نظر میں ماہ وش اور ہاتھ میں جامِ بدخشانی
شبابِ جاودانی ذرّے ذرّے کو عطا کرتا
ہر انساں پر میں بابِ عشرتِ جاوید وا کرتا
زمیں سے آسماں تک بیخودی جلوہ فگن ہوتی
ہر اک رنگیں جواں کی گود میں "سیمیں بدن" ہوتی
مری دُنیا کا ہر انساں جوانی کا مزہ چکھتا
حسیں، گوری، گداز اور نرم رانوں پہ سر رکھتا
نہ ڈر ہوتا جہنّم کا نہ خوں ریزی نہ پیری کا
مری دُنیا میں ہوتا ہر جگہ نقشہ امیری کا

نہ یُوں افلاس میں بے موت مرتے زندگی والے
نہ یُوں سرمایہ داری ڈال سکتی رزق پر تالے
نہ یُوں بے جُرم انسانوں کی خُوں کی ندّیاں بہتیں
نہ یُوں کمزور قومیں زور والوں کے ستم سہتیں

میرا شباب

آتشِ سیّال نے جس کو جلایا صبح و شام
سوزشِ ناسُور نے جس کو رُلایا صبح و شام
جس پہ مفلس کے بڑھاپے کا گماں ہوتا رہا
جس کا جوبن یاس کے آغوش میں سوتا رہا
حسرتیں جس کی ازل سے مونس و غمخوار ہیں

گلستانوں کے مہکتے پھول مثلِ خار ہیں
جس کی آہوں سے اثر روٹھا ہوا ہے اس طرح
بے نوا مزدور سے تقدیر روٹھے جس طرح
جس کی عشرت گاہ میں بجتا ہے چیخوں کا ستار
آنسوؤں سے غسل کرتا ہے جو شب کو بار بار
جس کی چشمِ ہوش رسوائی کے سائے میں کھلی
جس کی تحریرِ مقدّر ابرِ عصیاں سے دھلی
انگلیاں جس پر اٹھیں چلتے ہوئے بازار میں
دیکھتا ہے زندگی جو موت کے آزار میں
وہ ہے اک غربت زدہ الطاف کا رسوا شباب
ایسے جینے سے تو مجھ کو موت دے یا رب نشتاب
ورنہ دے وہ زندگی وہ شعر وہ حسنِ خطاب

سرزمینِ یاس میں پیدا کرے جو انقلاب
پھونک دے جو شعلہ آسا اس خش و خاشاک کو
ہر قدم پر دے شکستیں قسمتِ بیباک کو

آج پھر[1]

گِر رہا ہے آسماں سے مستیوں کا آبشار
فرصتوں سے کھیلتے ہیں زیست کے لیل و نہار

---

[1] یہ نظم جعفر شیرازی نے جو کسی زمانے میں میرے شاگرد تھے۔ میری کاپی سے نقل کر کے رسالہ "ساقی" دہلی کو بھیجدی۔ اور ساقی کے اگست نمبر ۱۹۳۸ء میں اُن کے نام سے شائع ہو گئی۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ساقی میں شائع ہونے سے پہلے یہ نظم متعدد رسائل میں میرے نام سے شائع ہو چکی تھی۔ الطاف

بزمِ فطرت کے لبِ گلگوں تبسم کار ہیں
شادمانی کے حسیں بازو گلے کا ہار ہیں

سایہ افگن ہے در و دیوار پر رنگِ نشاط
کروٹیں لیتا ہے رگ رگ میں سرورِ انبساط

ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے جوانی کا نکھار
آ گئی ہے گلستاں و ھر میں رنگیں بہار

کھل رہے ہیں عنبریں نافے فضا کی گود میں
کھیلتے ہیں کیف زا نغمے ہوا کی گود میں

مسکراتا ہے نگاہوں میں سرورِ جانفزا
چھا گئی ہے بزمِ ہستی پر مسرت کی گھٹا

اِس لئے کہ آج پھر چشمِ فسوں گر باز ہے
جس پہ میری شاعرانہ زندگی کو ناز ہے

دم زدن میں جو بڑھاپے کو جوانی کر گئے
زندگانی میں نظر سے مستیاں سی بھر گئے
جو بیاباں کو چمن کی گُل فشانی دے گئے
دِل کی مُٹھی میں سُرورِ جاودانی دے گئے
جو خزاں کو دے گئے رنگِ بہارِ جاوداں
جو نگاہوں سے دِلوں میں بو گئے موسیقیاں
جو ہواؤں میں گُلوں کی نکہتیں بکھرا گئے
جو خُمارِ سرمدی کی بارشیں برسا گئے
آ رہے ہیں بیخودی کی ڈال کر رُخ پر نقاب
آج پھر پینا پڑیگا مَے میں حل کر کے شباب

بتوں سے آیا ہوا پیغام

ہر لب ہو جس سے واقف وہ جام ہو نہ جائے
اِس کمسنی میں اِتنا بھی عام ہو نہ جائے

اِس شاعری سے ڈر ہے اتنی حسین جوانی
سرحد کی وادیوں میں بدنام ہو نہ جائے

اِظہارِ دردِ دل کی ہر ایک کو ہو جرأت
اِس درجہ مہ وشوں میں بدنام ہو نہ جائے

اِس شاعری سے ڈر ہے لالہ رخوں کا شکو
تاروں کو گنتے رہنا ہی کام ہو نہ جائے

اے رازداں سہیلی الطاف سے یہ کہنا
رُسوا تری طرح یہ پیغام ہو نہ جائے

غزل

دِل و جگر کو مرے داغدار رہنے دے
کسی کی سینے میں ہے یادگار رہنے دے

لبوں پہ موجِ تبسّم ہو آنکھ میں آنسو
خزاں میں پرتوِ رنگِ بہار رہنے دے

شکستِ لذّتِ گریہ ہے کربِ رُوحانی
میں اشکبار بھلا اشکبار رہنے دے

نہیں، نہیں مجھے راحت کی آرزُو ہی نہیں
اسی طرح سے مجھے بے قرار رہنے دے

نہ موجِ اشکِ حسیناں پہ بھُول اے الطافؔ
نہ ڈھونڈھ اُن میں دُرِ شاہوار رہنے دے

غزل

ترے جورِ بیجا کا مذکور کر دوں
تجھے ساری دنیا میں مشہور کر دوں

بتا کر تمہیں دِل کی شانِ محبّت
ابھی پیار کرنے پہ مجبور کر دوں

نظر میں تڑپتے ہیں جلوے ہزاروں
میں چاہوں تو ہر کوہ کو طُور کر دوں

لہُو بہہ کے آنکھوں سے کیوں جائے ضائع
اُسے حالِ دِل اپنا مسطُور کر دوں

میں الطاف رنگیں نوائی سے اپنی
فضائیں زمانہ کی معمُور کر دوں

غزل

زمیں دشمن، مخالف آسماں ہے — کرم تیرا کدھر یارب! کہاں ہے؟

درِ پیرِ مغاں پر ڈھونڈتا ہوں — میری ٹوٹی ہوئی توبہ کہاں ہے

جسے بجلی تُلی ہے پھونکنے پر — وہ مجھ بربادِ غم کا آشیاں ہے

اُٹھا لے آشیاں بُلبُل چمن سے — غضب آلود نگہِ باغباں ہے

مجھے کہنا ہے جو کچھ اُن سے الطاف — وہ میری خامشی سے خود عیاں ہے

غزل

ذرا روئے تاباں سے پردہ اُٹھا دیں
مِرے خرمنِ دل پہ بجلی گرا دیں

نگاہوں کے مینخانے سے کچھ پلا دیں
نہیں تو گھٹاؤں کو پیچھے ہٹا دیں

عرُوسِ بہار آ رہی ہے چمن میں
قفس کو لہو رو کے رنگیں بنا دیں

سجُودِ محبّت ادا کرنے والے
جبیں کو ترے در کا پتھر بنا دیں

نہ جانے وہ کس راہ سے ہو کے نکلیں
دیارِ محبّت میں سجدے بچھا دیں

وہ الطاف گھر میں ہمارے جو آئیں
خدا کی قسم گھر کو کعبہ بنا دیں

غزل

لیٹا ہوا ہوں سایۂ غربت میں گھر سے دُور
دل سے قریب ہیں اہلِ وطن اور نظر سے دُور
جب تک ہے دل رہینِ مآل و اسیرِ عقل
رہنا ہے تجھ سے اور تری رہگذر سے دُور
اے کیف اُن کی مست نگاہوں میں چھُپ کے آ
اے درد دم زدن میں ہو میرے جگر سے دُور
اِک دن اُلٹنے والی ہے زاھد بساطِ زہد
کب تک رہے گا دل نگہۂ فتنہ گر سے دُور
وہ کوئی زندگی ہے جوانی ہے وہ کوئی
اے دوست! جو ہے تیرے جمالِ نظر سے دُور

کیا آئی تیرے جی میں کہ تقدیر! یوں مجھے
پھینکا ہے لا کے وادیٔ غربت میں گھر سے دُور

اَے حُسنِ بے پناہ بتائے کوئی مجھے
دُنیا کی کون چیز ہے تیرے اثر سے دُور

اللہ رے نصیب کہ پائی ہے وہ فغاں
جو عمر بھر رہی ہے فریبِ اثر سے دُور

الطافؔ ناز اپنی گدائی پہ ہے مجھے
دامن ہے اس کا سایۂ لعل و گہر سے دُور

غزل

بھیگی ہوئی رُت یہ فسُوں ساز ہوائیں
اللہ وُہ ایسے ہیں سب مجھے یاد نہ آئیں
آؤ کہ میری آنکھ سے آنسُو نہیں تھمتے
آؤ کہ انہیں مِل کے ذرا دیر سُلائیں
پربت کے پرے جن میں جھلکتی ہے گلابی
اُن مست نظاروں میں کبھی خود کو گنوائیں
جانے کو تو اُس بزم میں جانا ہی پڑے گا
اَے دوست مگر ڈر ہے کہ کچھ بھُول نہ آئیں
اِلطاف ترے درد میں ڈوبے ہُوئے نغمے
اُس چشمِ فسوں ساز کو پُرنم نہ بنائیں

غزل

اُن کی محفل میں جا کے دیکھ لیا
دل کو بسمل بنا کے دیکھ لیا

تیرے تلوؤں کو پا سکی نہ جبیں
در پہ سجدے بچھا کے دیکھ لیا

دل کے زخموں پہ برق لہرائی
کس نے گھونگھٹ اٹھا کے دیکھ لیا

چشمِ میگوں سے پینے والوں نے
خُم کو مُنہ سے لگا کے دیکھ لیا

نہ بجھے پھر بھی داغِ دل نہ بجھے
شمعِ ہستی بُجھا کے دیکھ لیا

تیرے جلووں نے لی جو انگڑائی
خود کو موُسےٰ بنا کے دیکھ لیا

زندگی پردہ دارِ غم نہ ہوئی
ہر طرح آزما کے دیکھ لیا

غزل

اُس کی مغرور اداؤں کو جفا کہتا ہوں
دل کے گستاخ ارادوں کو وفا کہتا ہوں

ہائے اُن مست نگاہوں میں حیا کا عالم
شوخیاں جس پہ تصدق وہ حیا کہتا ہوں

بجلیاں بن کے نہ چمکے میرے ناسوروں پر
اپنی چتون سے کہو بہرِ خدا کہتا ہوں

دل جو مٹتا ہے مگر اُف نہیں کرتا غم میں
اُس کو میں لذّتِ تسلیم و رضا کہتا ہوں

وادئ حسن ہے دامن کو بچا کر الطاف
دیدۂ دل پہ ذرا پردہ گرا کر الطاف

غزل

ہماری نگاہوں میں ہو گر جوانی
بدل ڈالیں خوابوں سے دنیائے فانی

نہ مینا نہ پیشِ نظر ہے نہ وہ ہیں
لئے جا رہی ہے کدھر عمرِ فانی

زباں تھک گئی تو محبّت کا قصّہ
سُنانا پڑا آنسوؤں کی زبانی

وہ جب یاد آتے ہیں لیتا ہے کروٹ
شبِ ہجر میٹھا سا دردِ نہانی

فرشتوں کی فطرت سے پاکیزہ تر ہے
تبسّم کسی کا ہماری جوانی

لئے اُس نے دامن میں موتی سمجھ کر
مزا دے گئی آنسوؤں کی روانی

میں روتا ہوں الطاف راتوں کو اُٹھ کر
ستاتی ہے جب مجھ کو یادِ جوانی

غزل

پھر چھلکنے کو مئے گلفام پیمانے میں ہے
آج شاید شیخ پنہاں نوش میخانے میں ہے

اک ہجومِ یاس و غم ہے اور شبِ ہجراں دراز
رونقِ محفل میرے تاریک کاشانے میں ہے

بیخودی چھا جائے جس سے کائناتِ ہوش پر
وہ مئے دوآتشہ کیا تیرے پیمانے میں ہے؟

چشمِ ظاہر میں چراغِ شام ہے آتش بہ سر
پر کہاں وہ سوزشِ پنہاں جو پروانے میں ہے

گرمئی بازارِ محشر ہے ہمارے چنگ میں
محفلِ عالم کو تڑپائیں گے اپنے رنگ میں

غزل

نگاہِ مست میں کیا رنگِ والہانہ تھا
سرور و کیف میں ڈوبا ہوا زمانہ تھا

کسی کی اٹھتی جوانی کا جب زمانہ تھا
مری نگاہ کا ہر فعل شاعرانہ تھا

ستم نصیب کی اللہ رے سوختہ بختی
ہے بجلیوں کا نشیمن جو آشیانہ تھا

ازل سے قیدِ عناصر عطا ہوئی مجھکو
مرے نصیب میں زنداں کا آب و دانہ تھا

وفورِ درد سے جب ہچکیاں سی آنے لگیں
ہر ایک زخم کے لب پر مرا افسانہ تھا

شروعِ عشق میں کیا میری شاعری تھی نہ پوچھ
فلک پہ مُرغِ تخیّل کا آشیانہ تھا
وطن میں حضرتِ الطاف زندگی اپنی
بہارِ خُلدِ محبّت کا اِک فسانہ تھا

غزل

زہے قسمت گلستانِ تمنّا میں بہار آئی
مری اُجڑی ہُوئی راتوں میں سوزِ جانفزا لائی
سنبھل اَے رونے والے آہ تیری رانگو چھپ کر
فلک سے بربطِ ناہید کے نغمے چُرا لائی
کسی کے سُرمئی گھونگھٹ میں جلوے تلملا اُٹھے

کسی کے دل کے ناسوروں پہ اک بجلی سی لہرائی
پسینہ آگیا کالی گھٹاؤں کی جبینوں پر
جو اُن شانوں پہ لی زُلفوں نے متوالی سی انگڑائی
مرے افکار کی قندیل سے کونین روشن ہیں
مری تخئیل سے شمس و قمر نے ہے ضیا پائی

غزل

اگر تم کو دیارِ غیر ہی آباد کرنا تھا
مری پُر کیف راتوں کو نہ یُوں برباد کرنا تھا
قفس میں آشیاں میری نظر کے سامنے رہتا
تسلّی کے لئے اتنا تو اے صیّاد کرنا تھا

سحر کے وقت چکّی پر جگر خوں کُن نزالوں سے
کبھی پردیسیوں کی یاد کو بھی شاد کرنا تھا

سراپا کھونے والو شہر کی رنگیں فضاؤں میں
کبھی تو گاؤں کے ہمجولیوں کو یاد کرنا تھا

جبینِ بندگی میں عشق کی بتیا بیاں بھر کر
کسی کے آستانِ ناز کو آباد کرنا تھا

ابھی سے تھمنے والے دردِ باطن! یہ بھی سوچا ہے
دِلِ ناشاد کو کچھ اور بھی ناشاد کرنا تھا

وہ کہتی ہیں مجھے جب کھانسنے میں خوُن آتا ہے
تمہیں اپنی جوانی کو یونہی برباد کرنا تھا

لپٹ کر اُن کے قدموں سے کہا خاکسترِ دل نے
تسلّی ہو گئی، بس، اِس قدر برباد کرنا تھا!

چلو! صحرا نشیں ہم بھی تمہارے پاس آتے ہیں
کبھی تو دل نشیں ہونٹوں سے یہ ارشاد کرنا تھا

اگر رُکتی قضا دم بھر تو دُودِ آہ سے مجُھ کو
تہِ گردُوں نیا اک آسماں ایجاد کرنا تھا

لکھا ہے میں نے امرتسر ثریّا کو میری کمسن!
کبھی بھُولے سے الطافِ حزیں کو یاد کرنا تھا

غزل

ایک رنگیں قبا کو مضطرب پاکر

مستیاں آنکھوں کی صہبا ہیں ملا میرے لئے
آسماں سے چاند کا ساغر اُٹھا میرے لئے

کیوں نہ ہو جنّت یہ عالم کی فضا میرے لئے
مضطرب ہے آج اِک رنگیں قبا میرے لئے

روتے روتے اُن کی بینائی کی قوّت چھن گئی
تُو نے اے قاصد بتا یہ کیا کہا میرے لئے ؟

طُور کو جلووں پر اپنے ناز پھر ہونے لگا
پھر ذرا گھونگھٹ اُٹھا بجلی گرا میرے لئے

کیوں بدل ڈالوں نہ خاکِ ہند کے شام و سحر
ذرّہ ذرّہ ہے وطن کا دِلرُبا میرے لئے
رو کے وہ کہنے لگے الطاف سے وقتِ وداع
خاک میں رنگیں جوانی مت ملا میرے لئے

غزل

(لاہور کی ایک دِلرُبا یاد)

پھر کائناتِ یاد پہ لہرا گئی ہیں وُہ
سینے میں ایک آگ سی سُلگا گئی ہیں وُہ
اللہ رے چشمِ شوخ کا نظّارۂ حسیں
دل میں نظر کے ساتھ ہی خود آ گئی ہیں وُہ

اے آرزوئے دید! نگاہوں کا کیا قصور
اُٹھتے ہی اِن کے بام پہ شرما گئی ہیں وُہ
آئے گا پھر سے آنکھ میں ساون شباب پر
لاہور سے سُنا ہے کہ اُکتا گئی ہیں وُہ
روتی ہے آرزو مری سینے پہ رکھ کے ہات
شاید نظر کے تیر سے برما گئی ہیں وُہ
الطاف آ رہی تھیں اُٹھائے ہُوئے نقاب
پاتے ہی مُجھکو راہ میں گھبرا گئی ہیں وُہ

اوٹھا ہے جب تیغ ناور تیغ کی گردیں

سفینہ دریا پہ یوں ہے تا ہے گلشن کا کمال

جبینِ آئینہ سے تا ہے عروس ناز کا عکس

صبحدم گلستاں جلوہ سے حسین گلکاریاں

(۴)

سایہ فگن ہے فضا میں آج دیوالی کی شب
جگمگاتے ہیں در و دیوار پر زریں چراغ

رات پچھلے ایسے میں صبح وطن کی یاد سے
مسکرا اٹھے ہیں کسی مفلس کے سینے کے داغ

(۳۴)

آ رہی ہیں یاد غربت میں وطن کی صحبتیں
گر رہے ہیں اشک میری آنکھ سے بے اختیار

وقتِ جلسہ بیٹھنا پٹّی پہ ترتیبِ حسب سے
بچیوں کا ہاتھ سے گوندھنا ہوا اسکول ہار

(۴)

جا رہا ہوں سوئے میخانہ گھٹا اٹھی ہوئی

آ رہی ہے دور سے ساغر کھنکنے کی صدا

صحبتِ اہلِ یقیں ہے صبا نظر کو پائیے

ذوقِ نظارہ وہی ہے جستجو کی ابتدا

ع۔ ابوسلطان شیرازی ع

(۵)

ایک دوشیزہ پنہاں تھی لبِ آبِ رواں

پاؤں کی آہٹ سے میرے وہ سمٹ کر رہ گئی

رات کی دلہن کے گالوں پہ سپیدی صبح کی

نقش پیروں سے جو لپٹا تھا صبا لے آ گئی

(۶)

گاڑی ہے ایک ایک ترکی آتش نوا

زنبور آئے ٹری پہ بیٹھے ہوا میں اڑتے ہیں

بستہ ناکام ہے الفت کا وہ درد

جس طرح کہ دین تسکین اور ثبات کو دیتے ہیں

(۱)

دیکھ لطف تیرے سے افلاس کی گستاخیاں
چل دئیے ہیں چھوڑ کر سب اہلِ بسط الطاف کو

جس طرح گم کردہ منزل راہبر کا سایہ بھی
شب کی تاریکی میں چھٹ جائے ہے کہیں ساتھ کو

(۸)

تس ہے آدی ہنس ال ہونٹن ان سورج کی کرن

کھلتی ہیں آسماں زادی سلاہیں اس طرح

بوئے زلفوں کی طرح بیگانۂ ہوش و حواس

چھوتی ہیں انگلیاں مطرب کی بربط جس طرح

(۹)

چھا گیا ہے کیفِ میخانہ فلک سے چار سُو
چھن رہی ہے ابر سے کیا کٹوراں سے آتی ہوا
پیسے ذرہ ذرہ نگاہیں چھپے ٹھٹھک گھٹ کی اوٹ
دل کو بیاکل بن میں تیتر بیج سکے ساون دھار

(۱۰)

پچھلی راتوں میں جب گاتا ہے کوئی بے قرار
دل کی خاموشی سے یوں تنہا نہ اٹھائی ہے صدا

جیسے ہنگام سحر ساغر صبوحی کا لئے
نیند میں بستر سے کلیوں کو جگاتی ہے صبا

(١١)

کروٹیں لیتا ہے تسکیں کو جب فضاؤں میں سرور

بنیں کے پیر مرادوں کو ہم آغوش جب پاتا ہوں میں

سوار

جھلک جھلک کے دو پیش پر تیغ تیز کی

سے سیلاب سنا کے آنکھ لڑاتا ہوں میں

(۴)

رات ہنگامِ تعارف ایک معشوقہ سے گل
شرم سے یکہ بالا سے آئی گلابی ہو گئے

دیکھ سیدھی نظر سے ہو خراب میکدہ
بے صنم کے ساتھ سب شرابی ہو گئے

(۱۳۱)

وصل کی رات جب آیا کہیں حسین چہرے پہ جوبن
شرمِ انفعال کی اک گستاخ نے ڈالی نقاب

پیچاں کی دھوپ میں آئینے صبح و شام مخوالری
بہکے جوں اتنا سمجھ کوئی نزدیک سحاب

(١٢)

بهم آتشین نار حسن جلوهٔ گلبن گلستان آسمانکی آتشی

آج بکجه سینه‌سین یاران ایلر یاد ایچهرهٔ ارباب

دکمهٔ وقتهٔ

دردین دل و جانی بویله نعمول سن

ارزوی رخ بیگلیکسک الی حق عتاب

(۱۵)

تنکا ہوں تو اُٹھنے کی تکلیف نہ دے کر
ذرا اس جوانی کو نہ برباد کرنا
یہ دل اک اُجڑا سا ویراں پایا
اسے حسن کی ٹیسوں سے آباد کرنا

(۱۶)

تمہارے فسوں ساز جلووں کے ہاتھوں
نگاہوں کی بستی لٹی جا رہی ہے

چھپا لو انہیں زلف شبرنگیوں کی تہ میں
کہ ایمن کی وادی بھی شرما رہی ہے

(۱۰)

آنچ دریچے سے دروں میں کافور ہوا

دل سے نزدیک سکوں گلگلا کافور ہوا

چہرے سے سستیاں بینیں نکل

عمر افزا کو بلا و را

(١٨)

میرے پہلو سے اٹھ رہا ہے دھواں
کیا جبیں سے لئے اداس ہواں ہیں

آنکھ میں نم ہے دل میں غم کا ہجوم
سر سے اپنے زمین و آسماں ہیں

(۱۹)

میرے دل کو بے عشق کھونا ہے
میری آنکھوں کو عشق رونا ہے
میرے سینے کو چاہ سوزش کی
اور معدے کو عشق سونا ہے

(۴۰)

شب کو غربت میں نشترِ غم

دل سے زخموں کو چھیڑنے والے

تیری فرقت میں ہیں الٹے ہوئے یہ

آہیں بیکل ہیں مضطرب نالے

(۲۱)

ہیں آوارہ فلک پہ کالے بادل

حسیں آ بیٹھے ہیں اب پلانا ذرا سی

جو بلبل کے سائے میں گاتے تھے نغمے

وہی راگنی پھر سنانا ذرا سی

(۴۲)

جہان تیغ میں جو لذت گناہ نہ ہو
لبوں کی ساغر مے کی طرف نگاہ نہ ہو
شراب ناب کے چھلکے ہوئے سبو کی قسم
بشر کا زیست سے اک آن بھی نباہ نہ ہو

محمد صادق خوشنویس لوہاری گیٹ
پیر محمود زادہ
لاہور
1/3/39